اردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جولائی ۲۰۱۵ء تا ستمبر ۲۰۱۵ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنا قصہ خود سناتی ہیں:

''ایک مرتبہ میں نبی ﷺ کے ساتھ سفر میں گئی، اس وقت میں نوجوان تھی اور میرا وزن بھی ہلکا پھلکا تھا، سفر کے دوران نبی ﷺ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا: ''آپ لوگ آگے چلے جائیں'' سب آگے چلے گئے تو نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''آؤ، ہم دوڑ میں مقابلہ کریں'' چنانچہ ہم دونوں نے دوڑ میں مقابلہ کیا، میں نبی ﷺ سے آگے بڑھ گئی، آپ ﷺ خاموش رہے، پھر کافی عرصے بعد جب میرا جسم بھاری ہوگیا اور میں اس وقت اس مقابلہ کو بھول بھی چکی تھی، ایک بار پھر میں آپ ﷺ کے ساتھ سفر میں نکلی، راستے میں آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ''آپ لوگ آگے چلے جائیں'' جب سب آگے نکل گئے تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''آؤ! دوڑ میں مقابلہ کریں'' ہم دونوں نے دوڑ لگائی، اب کی بار نبی ﷺ نے مجھے پیچھے چھوڑ دیا، پھر آپ ﷺ نے ہنستے ہوئے ارشاد فرمایا: ''یہ دوڑ پہلی دوڑ کے بدلے میں ہے'' (یعنی اب معاملہ برابر ہوگیا)''

(مسند احمد، حدیث السیدہ عائشہ، الرقم: ۲۴۰۷۳)

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جولائی ۲۰۱۵ء تا ستمبر ۲۰۱۵ء

مُدیر:
نوید ظفر کیانی

مشاورت:
کے ایم خالد
روبینہ شاہین
محمد امین

ارمغان ابتسام

http://www.facebook.com/groups/83783856956 7305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت
mudeer_ai@yahoo.com

کیا کیا کہاں کہاں

سرگوشیاں ادارہ ۱۰

پرانے چاول

شاعری یا عذابِ الٰہی مشفق خواجہ ۱۱

ولائتی زعفران

حماقتیں کیا کیا آرٹ بکوالڈ / نوید ظفر کیانی ۱۴

قندِ شیریں

اُف یہ کتے سید عارف مصطفٰی ۱۷

درخواست نویسی خادم حسین مجاہد ۱۹

بھاگ میری بُلبل سید ظفر کاظمی ۲۲

باسی، اُباسی اور باس مارتی عید جمیل خان ۲۴

لالچی کتا عامر راہداری ۲۶

اِستری حماد احمد ۲۸

بٹ سے بٹ تک خرم بٹ ۳۲

گھر آیا مہمان کائنات بشیر ۳۴

خواتین کی ڈرائیونگ گل نوخیز اختر ۳۸

ڈاکٹر یوسف عالمگیرین ۴۱

خلاؤں میں اُڑتی شاعری راشد اشرف ۴۳

جھوٹ اسد قریشی ۴۹

ادا ۔رے کے ایم خالد ۵۰

جینوئن سپئر پارٹس نعیم طارق ۵۴

فسانۂ بے عروضی محمد عاطف مرزا ۵۷

کہانی ایک بیروزگار کی	عثمانی بلوچ	۵۹
عالمِ رویا میں	احمق ذہین آبادی	۶۱
چینی سالِ نو، بکری اور برمنگھم	ارمان یوسف	۶۴
تعزیت نامہ	سید بدر سعید	۶۶
ادیبوں کی اقسام	سکندر حیات بابا	۷۱
باتھ روم سنگرز	محمد ایوب صابر	۷۳
لال بجھکڑ لال قلعے میں	شوکت علی مظفر	۷۵
تونسہ شریف کا جغرافیہ	عبدالجبار قیصرانی بلوچ	۷۸
چاؤ چائے	نادر خان سرگروہ	۸۱
پروفیسرِ بے وقت	ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی	۸۳
ہاہاہا۔۔۔ہی ہی ہی۔۔۔ہو ہو ہو	کائنات بشیر	۸۶

غزلیات

کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا حوصلہ کم پڑ گیا	ڈاکٹر مظہر عباس رضوی	۸۸
آتا نظر ہے یار طرحدار خواب میں	ڈاکٹر مظہر عباس رضوی	۸۸
وہ پھرتا ہے کیوں مارا مارا زمیں پر	ڈاکٹر عزیز فیصل	۸۹
یاد ہم کر کے جن کو روتے ہیں	ڈاکٹر عزیز فیصل	۸۹
پہلے ہوئی جدائی اکیسویں صدی میں	سید فہیم الدین	۹۰
محفل میں وہ حسین ہے اب اوٹ کے بغیر	سید فہیم الدین	۹۰
اب عطا ہوتی ہے نعمت جوتیوں کے ہار کی	محمد عاطف مرزا	۹۱
اکیلی وہ نہیں آئی، کہیں پھڈا نہ ہو جائے	محمد عاطف مرزا	۹۱
جس گلی سے گزر گیا ہوں میں	عرفان قادر	۹۲
تین برسوں میں ولد پانچ کی تعداد میں ہے	عرفان قادر	۹۲
مرغانِ مرغن ہو کہ بکرانِ گرامی	خالد محمود	۹۳
کھائی ہے جو بھولے سے دوا اور طرح کی	خالد محمود	۹۳

لیڈر تو یونہی قوم کی خدمت نہیں کرتا	روبینہ شاہین بیناؔ	۹۴
گھر ہی اب چھوڑ گیا پیسے ادھارے لے کر	روبینہ شاہین بیناؔ	۹۴
جو ہر برس نیا ماڈل یہاں بناتے ہیں	نوید ظفر کیانیؔ	۹۵
لگتی ہے مجھے صاحبِ مغرور کی گردن	نوید ظفر کیانیؔ	۹۵
اُس شوخ کی مشکل کو سنبھالے کے لئے ہم	خالدؔ عرفان	۹۶
عدالت کی ہر اک تعزیر سے تنگ آ گئے ہیں	خالدؔ عرفان	۹۶
اُس نے جب ہم سے کہا اھلاً وسھلاً مرحبا	شوکتؔ جمال	۹۷
اُن سے جب تنہائی میں میری ملاقاتیں ہوئیں	شوکتؔ جمال	۹۷
دیکھ کر دل میں لڈو لگے پھوٹنے جب وہ آئے تو پوری غزل ہوگئی	تنویر الدین احمد پھولؔ	۹۸
میم بیوی اور ہے خاوند جاٹ	تنویر الدین احمد پھولؔ	۹۸
بہت سے کارنمایاں جو خُر کے دیکھتے ہیں	عبدالحکیم ناصفؔ	۹۹
تم نہ مانو مگر حقیقت ہے	عبدالحکیم ناصفؔ	۹۹
ہماری جو مغرب زدہ کچھ خواتین ہیں	عبدالحکیم ناصفؔ	۱۰۰
آنکھ دھونے کی اجازت نہیں دی جائے گی	عبدالحکیم ناصفؔ	۱۰۰
فوج بچوں کی ہدف پر تیر ہے	منزہ سید	۱۰۱
گر ہمیں فرصت ہو تو کاموں میں گڑنا چاہیے	منزہ سید	۱۰۱
ہیں خدایا کیوں بُرے احوال پاکستان کے	ریاضؔ احمد قادری	۱۰۲
بڑھاپے میں بھی جو عہدِ شباب ڈھونڈتے ہیں	ریاضؔ احمد قادری	۱۰۲
عاشقی میں پھنسا لیا خود کو	نویدؔ صدیقی	۱۰۳
ضعیف اتنے کہ بکری کو گاں سمجھتے ہیں	نویدؔ صدیقی	۱۰۳
نوٹ اُن کو تھما کے دیکھا ہے	خاوریؔ	۱۰۴
اس لئے صورت ہے مرجھائی بہت	خاوریؔ	۱۰۴
حُسن جب بھی علیل ہوتا ہے	اقبال شانہؔ	۱۰۵
تم نے جب چھوڑ دیا ساتھ دواخانے میں	اقبال شانہؔ	۱۰۵

ہمت نہیں کسی میں ہے اُس سے سوال کی	احمد علی برقی اعظمی	۱۰۶
آپ کی نظروں نے سمجھا نوٹ کے قابل مجھے	احمد علوی	۱۰۶
اس نے کس درجہ محبت سے بنایا حلوہ	منیر انور	۱۰۷
محلے کا بیچارہ کس لئے جی؟	نور جمشید پوری	۱۰۷
وطن فروشی کا جن ہی پکڑ کے دیکھتے ہیں	محمد ظہیر قندیل	۱۰۸
روٹی پہ آڑر رکھ کے پکانا پڑا مجھے	شہزاد قیس	۱۰۸
اگرچہ ذہن میں اِک قافیہ کمال کا ہے	رحمان حفیظ	۱۰۹
میر ڈ دکھائی دے نہ کنوارا دکھائی دے	محمد شہزاد قمر آسی	۱۰۹
یوں ٹیکسٹ فیس بک پر تو گڈ مارننگ کا تھا	غضنفر علی	۱۱۰
شب برات کی سوچ میں بیٹھا ایک پٹاخہ سوچ رہا ہوں	طاہر محمود	۱۱۰
یوں تو کل دنیا ہے فانی جی کے دیکھ	مسعود قاضی	۱۱۱
یہی اچھا لگا مجھ کو ذلالت چھوڑ دی میں نے	زبیر قیصر	۱۱۱
میں اپنی وال پر پکچر پرانی لے کے آیا ہوں	ہاشم علی خان ہمدم	۱۱۲
درد کی رات اور تنہائی	اسد قریشی	۱۱۲

سلسلہ وار

سفر ہے شرط (باب چہارم)	جیروم کے جیروم / نوید ظفر کیانی	۱۱۳

قطعات

حکمِ حاکم	نوید ظفر کیانی	۲۰
بیمہ ایجنٹ	نوید ظفر کیانی	۲۴
بہانہ	نوید ظفر کیانی	۳۳
غلط فہمی	نوید ظفر کیانی	۳۹
خراٹے	نوید ظفر کیانی	۴۴
دیدہ دلیری	نوید ظفر کیانی	۶۷
جھوٹ	نوید ظفر کیانی	۷۷

شیطان جن ہے	تنویرالدین احمد پھولؔ	۱۲۴
ملاوٹ	تنویرالدین احمد پھولؔ	۱۲۴
دعویٰ	تنویرالدین احمد پھولؔ	۱۲۴
بونے سسٹم	تنویرالدین احمد پھولؔ	۱۲۴
انقلاب	تنویرالدین احمد پھولؔ	۱۲۴
امریکن سسٹم	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۵
تضاد	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۵
معجزہ	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۵
دل کا بائی پاس	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۵
شکایت	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۵
فی میل پاور	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۵
واسا	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۶
نو ویکنیسی	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۶
مس بٹ	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۶
خوشحالی	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۶
فیشن	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۶
برائے فیشن	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۲۶
سول انجینئر	ڈاکٹر عزیزؔ فیصل	۱۲۷
آٹے کی قطار	خالدؔ عرفان	۱۲۷
گرمی	خالدؔ عرفان	۱۲۷
حلقہ اربابِ دوزخ	ڈاکٹر عزیزؔ فیصل	۱۲۷
ڈیڈ	خالدؔ عرفان	۱۲۷
قحط	خالدؔ عرفان	۱۲۷
Exploitation	خالد محمود	۱۲۸

دعوتِ آم	عبدالحکیم ناصفؔ	۱۲۸
Choice	غضنفر علی	۱۲۸
Sea View Venue	عبدالحکیم ناصفؔ	۱۲۸
ثنا	غضنفر علی	۱۲۸
کل اور آج	غضنفر علی	۱۲۸
جادوگر ساس	حماد حسن	۱۲۹
الحذر	حماد حسن	۱۲۹
امتحان	احمد علوی	۱۲۹
رنگین مزاج	حماد حسن	۱۲۹
معجزہ	حماد حسن	۱۲۹
تنگ قافیہ	احمد علوی	۱۲۹
استقبالِ رمضان	تنویر الدین احمد پھولؔ	۱۳۰
انمول موتی	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۳۰
تیز رفتاری	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۳۰
مفت انجکشن	تنویر الدین احمد پھولؔ	۱۳۰
شوق	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۳۰
مجھے علم نہیں	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۳۰

ھائیکو

اس دور کے جواں	نوید ظفر کیانیؔ	۶۸

خصوصی گوشہ

انشاء اللہ خان انشاء۔ معرکہ آرائے سخن	روبینہ شاہین بیناؔ	۱۳۱

نظمالوجی

ای کتاب	ڈاکٹر مظہر عباس رضوی	۱۴۱
اسلام آباد میں الرجی	ڈاکٹر مظہر عباس رضوی	۱۴۲

گنجا	خالد محمود	۱۴۳
ٹیکسٹ میسج	خالد عرفان	۱۴۴
امید	ڈاکٹر عزیز فیصل	۱۴۵
فیس بک کا نقاد	منزہ سید	۱۴۶
ماہیے	تنویر الدین احمد پھولؔ	۱۴۷
ہمیں کیا پتہ تھا	شوکتؔ جمال	۱۴۸
میڈیا	شاہد عدیلی	۱۴۹
سہرے کی یہ لڑیاں مبارک	شہباز چوہان	۱۵۰
شاعرہ	محمد ظہیر قندیلؔ	۱۵۱
اشتہار	محمد خلیل الرحمٰن	۱۵۲
ٹیڑھی کھیر	حماد حسن	۱۵۳
دو مختصر نظمیں	ڈاکٹر سعید اقبال سعدیؔ	۱۵۴
حالات کا شیونگ ریزر	محمد عاطف مرزا	۱۵۵
سہرہ	احمد علوی	۱۵۶

یادش بخیر

صدارت	ابنِ انشاء	۱۵۷

شرارتی لکیریں

کارٹون	ادارہ	۱۶۰

مشفق خواجہ

شاعری یا عذابِ الٰہی

ہم آج تک یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ منیر نیازی شاعری اچھی کرتے ہیں یا باتیں۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے چاروں طرف قوس قزح کے رنگ برس رہے ہوں اور ان کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جیسے وہ خود برس رہے ہوں۔ وہ غصے میں آجاتے ہیں تو اچھے اچھوں کی، یہاں تک کہ خود اپنی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اشخاص ہوں یا ادارے، ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے وہ مصلحت کوشی سے کام نہیں لیتے، جو جی میں آتا ہے کہہ جاتے ہیں۔

گفتگو کے دوران ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ وہ نغز گو شاعر کی بجائے شاعر کے اندر رہنے والا معصوم بچہ بن جاتے ہیں۔ ایک ایسا بچہ جو ہر کھلونے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔ منیر نیازی کا پسندیدہ کھلونا رائٹرز گلڈ کا ادبی انعام ہے۔ ان کے جتنے انٹرویو بھی چھپے ہیں ان میں وہ رائٹرز گلڈ کے انعامات کی تقسیم میں بدعنوانیوں کا ذکر ضرور کرتے ہیں، حالاں کہ اب زمانہ اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ خود رائٹرز گلڈ کا شمار بھی بدعنوانیوں میں ہوتا ہے۔

منیر نیازی کی معصومیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ فیض احمد فیض کے انتقال کے بعد ان سے کسی نے پوچھا، ''فیض کی موت سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پر کرنے کے لیے آپ کس کا نام پیش کریں گے؟'' انہوں نے فرمایا ''یہ بات میرے سوچنے کی نہیں، آپ لوگوں کے سوچنے کی ہے۔'' ہم تو سمجھتے تھے کہ فیض اپنے پیچھے بے مثال کلام کے کئی مجموعے چھوڑ گئے ہیں، اب معلوم ہوا کہ خلا ہی خلا ہے جسے منیر نیازی پُر کریں گے۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے کہا تھا کہ ہندوستان میں منیر نیازی کی پرستش ہوتی ہے۔ یہ بات منیر نیازی کو اتنی پسند آئی کہ وہ ایک عرصے تک ہر جگہ اس کا حوالہ دیتے رہے۔ ایک دن کسی ستم ظریف نے ان سے کہا ''ہندوستان میں تو گائے اور پتھر پوجے جاتے ہیں۔ آپ کو کوئی کیوں پوجے گا۔'' منیر نیازی نے جواب دیا ''آپ سنی سنائی بات کررہے ہیں، نارنگ نے آنکھوں دیکھی بیان کی ہے۔'' ستم ظریف نے گرہ لگائی ''نارنگ مذاق بھی تو کرسکتے ہیں۔'' منیر نیازی نے یہ کہہ کر ان صاحب کا منہ بند کردیا ''نارنگ صرف تنقیدی مضامین میں مذاق کرتے ہیں، گفتگو میں وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہیں۔''

منیر نیازی کا تازہ ترین انٹرویو حال ہی میں کراچی کے ایک اخبار میں شائع ہوا ہے، ان کے پچھلے تمام انٹرویوز سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں غصہ بھی اپنے عروج پر ہے اور معصومیت بھی۔

منیر نیازی سے سوال کیا گیا ''کیا مشاعروں سے شاعری کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟'' منیر نیازی نے جواب دیا ''ہاں پہنچتا ہے۔۔۔ ہمیں تو شکر ادا کرنا چاہئے کہ ہماری قوم میں شاعر پیدا ہوئے ہیں جو سوسائٹی میں ادب کا شوق پیدا کررہے ہیں لیکن دوسری طرف نقص یہ ہے کہ وہ جو مضامین نظم بند کررہے ہیں ان میں کوئی نیا پن نہیں ہے۔ ایک ہی بات کو رگڑے جارہے ہیں۔ حرف کی تکرار سے انہوں نے ذہنوں کو بوجھل کردیا ہے۔ پریشان کردیا ہے قاری کو۔''

منیر نیازی ایک طرف تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہماری

ایک بار شہنشاہ ایران صدر اسکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا کو ہمراہ لے کر اصفہان، شیراز اور مشہد کی سیر کو گئے۔ طویل فاصلے تو ہوائی جہاز سے طے کئے گئے، لیکن مقامی سیر وسیاحت کے لئے شاہ کے جلو میں موٹر کاروں کا بڑا شاندار قافلہ چلتا تھا۔ موٹروں کا یہ شاہی جلوس جب کسی گاؤں یا قصبے سے گزرتا تھا تو کئی جگہ سڑک پر دور دور تک قالین ہی قالین بچھے نظر آتے تھے۔ بعد میں یہ راز کھلا کہ قالین میں اگر بہت زیادہ گرد جم کر بیٹھ جائے تو اسے صاف کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اسے چلتی ہوئی موٹر کار کے پہیوں کے نیچے روندا جائے۔ اسطرح گرد کی جمی ہوئی تہیں ٹوٹ جاتی ہیں اور تھوڑا سا جھاڑنے سے بھی قالین صاف ہو جاتا ہے۔ اس ترکیب سے شاہ کی گزرگاہوں میں اپنا قالین بچھا کر اُس کی وفادار رعایا ایک ہاتھ سے پہلوی خاندان کی ہر دلعزیزی پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دیتی تھی اور دوسرے ہاتھ سے اپنے قالینوں کی گرد بھی جھاڑ لیا کرتی تھی۔

شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب

قوم میں شاعر پیدا ہوئے ہیں، دوسری طرف انہیں شکایت ہے کہ شعرائے کرام قاری کو پریشان کر رہے ہیں۔ منیر نیازی کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس رفتار سے شعرائے کرام پیدا ہو رہے ہیں، اس کے مقابلے پر قارئین کی شرح پیدائش بہت کم ہے، اور اس کا امکان ہے کہ آگے چل کر یہ جنس بالکل معدوم ہو جائے۔ ایسی صورت میں قاری کی پریشانی کا تذکرہ غیر ضروری ہے، شعرائے کرام کی پیدائش پر شکر ادا کرتے رہنا ہی کافی ہے۔ نیز اس عذاب الٰہی سے ڈرتے رہنا چاہئے جو شاعروں کی صورت میں قوموں پر مسلط کیا جاتا ہے۔

ایک سوال یہ تھا "نئی نسل کے شعراء نے آپ کو اپنا آئیڈیل بنایا اور پچھلی دو دہائیوں کے شعراء نے آپ کی شاعری کو سامنے رکھ کر اپنا اسلوب بنانے کی کوشش کی۔ یہ سب لوگ جو کچھ لکھ رہے ہیں، آپ کے سامنے ہے۔ آپ کیسا محسوس کرتے ہیں۔ کیا پُر امید ہیں۔"

اُس کا یہ جواب عطا ہوا "یہ لوگ تھوڑی دیر کیلئے مجھے اپنا آئیڈیل بناتے ہیں اور پھر ان کی اپنی خودی بیدار ہو جاتی ہے اور کہتے ہیں ہم پر کسی کا سایہ نہیں۔۔۔۔ ان لوگوں میں بیشتر کا بڑا چرچا رہا۔ پانچ برس بعد ان کا پتا ہی نہیں ملتا۔"

ہمیں ان شاعروں سے دلی ہمدردی ہے جنھوں نے منیر نیازی کو اپنا آئیڈیل بنایا اور پانچ دس برسوں ہی میں بے نام ونشان ہو گئے۔ ہمیں منیر نیازی سے بھی ہمدردی ہے کہ انہیں وہی شاعر اپنا آئیڈیل بناتے ہیں جن کی خودی بہت جلد بلکہ وقت سے پہلے بیدار ہو جاتی ہے۔ دراصل اس معاملے میں ان شاعروں کو موردِ الزام ٹھہرانا درست نہیں۔ سارا قصور علامہ اقبال کا ہے جنھوں نے قوم کو خودی کی بیداری کا سبق پڑھایا۔ قوم نے تو اس تلقین کا کوئی اثر نہ لیا، شاعر چونکہ حساس ہوتے ہیں، اس لیے وہ فوراً علامہ کے دکھائے ہوئے راستے پر چل پڑتے ہیں۔ یوں منیر نیازی کو اپنا آئیڈیل بنانے والے گمراہ ہو جاتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک سوال یہ بھی تھا "جب نئی نسل نے آپ کو آئیڈیل بنایا تو کیا آپ خود بھی سمجھتے ہیں کہ آپ نے آئیڈیل شاعری کی ہے۔" منیر نیازی نے اس کے جواب میں کہا "میں نے اپنے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ یہ تو تم لوگ ہی مجھے آکر بتاتے ہو کہ آپ بڑے منفرد شاعر ہیں۔ آپ تو آئیڈیل ہیں ہمارے۔ میں کچھ دیر تو اس مزے میں رہتا ہوں لیکن پھر میں اس مزے اور چارم سے آزاد ہو جاتا ہوں۔"

یہ عجیب قصہ ہے کہ آئیڈیل بنانے والے منیر نیازی کے اثرات سے اور خود منیر نیازی آئیڈیل بننے کے مزے اور چارم سے بہت جلد آزاد ہو جاتے ہیں۔ آزادی اچھی چیز ہے مگر ایسی بھی کیا آزادی جس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو!

منیر نیازی نقادوں سے سخت بیزار ہیں۔ فرماتے ہیں "عبادت بریلوی اور اپنے تمام سینئر نقادوں کو میں نے پڑھا ہے اور دیکھا بھی۔ وہ ایک جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور ظلم یہ ہوا کہ تنقید کا

سارا علم جو انہوں نے حاصل کیا، اس کو کسی غلط آدمی پر صرف کر دیا۔ غلط آدمی کو گواہی دینا بڑا خطرناک کام ہے۔۔۔ یہ سب کچھ کام چلانے کے لیے ہو رہا ہے۔ کہیں محکمانہ ترقی کے لیے، کہیں نوکری کے لیے، کہیں گروہ بندی کے لیے، انہیں یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ ایک چکر ہے جو چلتا رہتا ہے۔ اس کے پیچھے کوئی خلوص نہیں ہے۔ سب دکانیں چمکا رہے ہیں۔ اگر یہ نقاد بھرے پیٹ کے لوگ ہوتے تو شاید ایسا نہ ہوتا اور اگر ان کے پاؤں کے نیچے زمین ہوتی تو شاید یہ لوگ ایسی بات نہ کرتے۔" منیر نیازی کا یہ کہنا کہ انہوں نے عبادت بریلوی وغیرہ کو پڑھا ہے، ایک ناقابل یقین دعویٰ ہے۔ اس قسم کے نقادوں کو پڑھنے کے بعد شاعری تو کیا، روزمرہ اخلاق کا معیار برقرار رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ منیر نیازی نے اگر ان نقادوں کو پڑھا ہوتا تو وہ ہرگز اتنے اچھے شاعر نہ ہوتے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ منیر نیازی، تنقید تو کیا، کوئی چیز بھی پڑھنے کے قائل نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ٹی وی کے ایک مذاکرے میں حصہ لیا اور شروع سے آخر تک خاموش رہے۔ مذاکرے کے آخر میں سراج منیر نے منیر نیازی سے کہا "آپ کی خاموشی ہماری گویائی پر حاوی ہوگئی۔" انہوں نے جواب دیا "مجھے کتابی گفتگو میں داخل ہونے کا دروازہ نہیں ملتا۔" یہ واقعہ خود منیر نیازی نے زیرِ تبصرہ انٹرویو میں بیان کیا ہے جس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ منیر نیازی کو کتابی گفتگو اور کتاب، دونوں ہی کا دروازہ نہیں ملتا۔

ایک سوال یہ تھا "آپ کو اپنے ہم عصروں میں کوئی ایسا شاعر بھی نظر آیا جسے شاعری کے اعلیٰ مقام پر فائز کیا جاسکے؟" جواب یہ تھا "میرا تو جی چاہتا ہے سبھی کو اعلیٰ مقام پر فائز کر دوں تاکہ یہ آپس میں جھگڑنا بند کر دیں۔ میرا بس چلے تو ایک منسٹری بناؤں جس میں سب کو وزیر کر دوں۔"

مطلب یہ کہ منیر نیازی کا جی چاہتا ہے کہ سبھی شاعروں کو اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا جائے لیکن ان میں کوئی اس منصب کا اہل ہی نہیں۔ منسٹری والی بات بھی مزے کی ہے۔ پہلے تو منیر نیازی اقتدار کے اس درجے پر فائز ہوں گے جہاں منسٹری قائم کرنا ان کے اختیار میں ہوگا اور پھر ایک ہی منسٹری میں بہت سے شاعروں کو وزیر بنا دیا جائے گا تاکہ انہیں جھگڑنے کے مواقع پہلے سے زیادہ ملیں۔

سوال کرنے والے نے ایک موقع پر مبارک احمد کو نثری نظم کا بانی قرار دیا تو منیر نیازی نے کہا "بھئی مجھے تو وہ بانی نہیں لگتا۔ بلکہ مجھے آپ کا قمر جمیل زیادہ بانی لگتا ہے۔" ایک بار مجھے سراج منیر نے بتایا کہ یہاں (لاہور) سو فٹ کنواں کھود کر پانی نکلتا ہے تو کراچی میں قمر جمیل نے ایک ایک فٹ کے سو کنویں کھود دیئے ہیں۔ ان کی پینٹنگ سے وابستگی، آرٹ سے دلچسپی، شاعری سے وابستگی، تنقید سے دلچسپی ایک ایک فٹ کے کنویں کھودنے والی بات ہے۔

ہم نے تو یہ سنا تھا کہ بعض لوگ نیکی کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ اب معلوم ہوا کہ شاعری مصوری اور تنقید وغیرہ کو ٹھکانے لگانے کے لیے کنویں کھودنے پڑتے ہیں۔

(۵ فروری ۱۹۸۷ء)

یادش بخیر اُردو زبان کے مشہور محقق، ادیب اور شاعر جناب شان الحق حقی کی خود فراموشی کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔

جب شان صاحب جیکب لائن کی مسجد کے قریب رہتے تھے تو اکثر یہ بھول جاتے تھے کہ وہ شان الحق ہیں یا مولانا احتشام الحق ہیں۔ ہم نے شان صاحب کو بارہا صندوق کے تالے کی چابی سے موٹر اسٹارٹ کرتے دیکھا اور یوں بھی ہوا کہ وہ اپنی موٹر کے دھوکے میں کسی اور موٹر میں آ بیٹھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ اس خیال میں بیگم شان الحق موٹر میں بیٹھی ہیں، شان صاحب نے موٹر چلا دی اور جب گھر پہنچے تو پتہ چلا کہ بیگم صاحبہ آٹو رکشہ سے آئی ہیں۔

بات سے بات از نصراللہ خان

آرٹ بکوالڈ / نوید ظفر کیانی

حجامتیں کیا کیا

ٹھیک ہے۔۔۔۔تو پھر تم اس کو بال کٹوانے کے لئے کیوں نہیں لے جاتے؟

یہ قولِ زرّیں میری بیوی کا تھا اور یہ بیان ایک طویل بحث کے بعد جاری کیا گیا تھا جس کے دوران میں نے غلطی سے بس اِتنا کہہ دیا تھا کہ "بچے کے بال بہت بڑھ گئے ہیں اور کٹوانے کے قابل ہوگئے ہیں"۔

متذکرہ بچہ محض چھ برس کا تھا اور ابھی اِس قابل بھی نہیں ہوا تھا کہ ڈاکٹر اور نائی کے درمیان فرق بیان کر سکے اور وہ تھا بھی حق بجانب کیونکہ دونوں اصحاب سفید چوغا پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور دونوں کے پاس بچوں پر استعمال کرنے کے لئے ایذا رسانی کے سینکڑوں آلات ہوتے ہیں۔یہی بچہ جب پہلی بار نائی کے پاس گیا تو سعادتمند بچوں کی طرح از خود اپنی پتلون اتار دی اور اپنی تشریف پر ڈاکٹر کی طرف سے کسی انجکشن کا انتظار کرنے لگا۔اسی طرح ایک بار جب وہ ڈاکٹر کے کلینک گیا تو میرے کچھ کہنے سے پیشتر خود ہی اُس سے کہنے لگا کہ میرے بال ایسے کر دیں جیسے "مسٹرٹی" کے ہیں۔دونوں صورتوں میں اُس نے متذکرہ اصحاب کو اُن کے اصل فرائض ادا کرنے سے روک دیا۔

میری بیوی مجھے اکثر خواتین کا ایک رسالہ دکھایا کرتی ہے۔ اس زنانہ رسالے کا ہر نمایاں مضمون، جو کہ کسی نام نہاد ماہر نفسیاتِ اطفال خاتون کا تحریر کردہ ہوتا ہے، یہی ثابت کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں کہ امریکہ کے تمام والدین اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ یا تو اپنے بچوں کو دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیں یا پھر اُن کے اوائلِ طفولیت میں ہی زبردستی اُن کی شادی کروا دیں۔

اِسی مخصوص رسالے نے ایک جگہ پر واضح کیا ہے کہ یہ والد کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ اپنے لڑکے کو نائی کے پاس لے کر جائیں کیونکہ بالوں کا بلاواسطہ تعلق مردانگی سے ہے اور اگر بچوں کی والدہ اُن کے بال کٹوانے اُنہیں نائی کے پاس لے جائیں گی اور وہ بال کٹوانے کے دوران برانگیختہ ہوا تو وہ اس کا قصوروار نائی کے بجائے اپنی والدہ کو ٹھہرائے گا اور اُن کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا۔

بہر حال، اس جدید دور میں کسی مائی کے لعل کی ہمت نہیں کہ وہ کسی بچوں کے نفسیاتی ماہر سے اختلاف کا اظہار کر سکے چنانچہ میں نے خیریت اِسی میں جانی کہ چُپ چاپ بچے کا ہاتھ تھاموں اور سیدھے سبھاؤ نائی کی دوکان کا رُخ کروں۔

آپ شائد سوچ رہے ہوں گے کہ بچہ خوشی خوشی نائی کے پاس جانے کی خبر سُنے گا اور اسے آؤٹنگ سے منسوب کرے گا، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔اُس کا منہ میری بیوی سے بھی زیادہ پھول گیا۔ میں

نے اُسے متذکرہ بالا زنانہ رسالہ دکھا کر قائل کرنا چاہا لیکن اُس نے رسالے کا وہی حشر کیا جو میں کرنا چاہتا تھا لیکن فسادِ خلق کے خوف سے کر نہیں پاتا تھا، یعنی اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور ہوا میں بکھیر دیا۔

مجھے اپنے والد ہونے کا استحقاق استعمال کرنا پڑا۔۔۔۔ میں نے کہا ''اگر تم میرے ساتھ نائی کی دوکان پر چلے چلو تو میں تمہیں ایک کھلونا لے کر دوں گا!''

کون سا والا کھلونا؟؟ اُس نے پوچھا، اُسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ سودا کاری کی بہتر پوزیشن میں ہے۔

''بہت بڑا کھلونا'' ۔۔۔ میں نے تقریباً دہاڑتے ہوئے کہا ۔۔۔ ''یہ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔۔۔!!''

کیا آپ کونی اور جینیفر کو بھی کھلونے لے کر دیں گے؟ ۔۔۔ اُس نے پوچھا۔ اب وہ اپنی بہنوں کے لئے بھی مجھ سے سودا کاری کر رہا تھا۔

''کیوں نہیں ۔۔۔ ضرور!! بلکہ ہم کارٹر کی دوکان پر بھی جائیں گے اور تمہاری مما کے لئے ایک ہیرے کا نیکلس بھی خریدیں گے اور اُس کے بعد ہم کسی دکان سے تمہاری نینی کے لئے بھی کچھ خریدیں گے، فکر کاہے کی کرتے ہو'' ۔۔۔ میں نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا۔

اگلے دن علی الصباح ہم دونوں باپ بیٹا نائی کی دوکان کے لئے روانہ ہو گئے۔ میرا بیٹا بضد تھا کہ وہ اُسی نائی کے پاس جائے گا جس پر اُس کی ہمراہی میں جایا کرتا ہوں۔ شائد میں نے آپ کو نہیں بتایا ہے کہ اول تو میرا نائی پیشگی اپوائنٹمنٹ کے بغیر دستیاب نہیں ہوتا۔ اُس سے اپوائنٹمنٹ لینا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا وائٹ ہاؤس میں داخل ہونا اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ ہے بھی خاصا مہنگا۔

جب میں نائی کی دوکان میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''آپ نے پیشگی مطلع نہیں فرمایا اپنی آمد سے'' ۔۔۔ اُس نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے اپنی حجامت نہیں بنوانی ۔۔۔ میرے بیٹے کی حجامت کا معاملہ ہے!''

نکموں کا کام

اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔۔۔ وہ بولا۔۔۔ ''میں رات گئے الجیریا کے علاقے کی طرف نہیں جاتا، گاڑی کبھی ایک سو پچاس سے زیادہ رفتار سے نہیں چلاتا، کافی ہاؤسسز میں لڑائی جھگڑے نہیں کرتا نہ ہی بچوں کے بال کاٹتا ہے۔''

میں نے چپکے سے پانچ سو فرانک اُس کی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''اس کو اسپیشل کیس سمجھ لو، وعدہ رہا، کسی کو بھی نہیں بتاؤں گا!''

''آس پاس کے سب ہمسائیگان کو پتہ چل جائے گا، وہ ڈاکٹر جو دانتوں کی مارکیٹ سے جھانک کر دیکھ رہا ہے، اُسے بھی پتہ چل جائے گا، وہ مریض جو اس بچے کے بعد والی سیٹ پر بیٹھا ہے، وہ بھی آگاہ ہو جائے گا، پلیز، اِسے کہیں اور لے جائیں!!''

میں نے پانچ سو فرانک کا ایک اور نوٹ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''میں نے پہلے تم سے کبھی ایسی بات کی؟ نہیں ناں، میں اس کے عیوض تمہاری ہر قسم کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔۔۔ میں تمہارے گاہکوں کی تعداد میں اضافہ کر دوں گا، تمہاری تصویر اخبار میں چھاپ دوں گا، میں تمہاری کار دھو دوں گا۔۔۔ پلیز، پلیز، پلیز!!!''

ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن یاد رہے، صرف ایک بار، آئندہ کبھی نہیں۔۔۔!''

اس سے پہلے کہ نائی اس امر پر نظر ثانی کرتا کہ وہ جذبات میں کیا کہہ گیا ہے، میں نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔

جونہی نائی نے اپنی قینچی اُٹھائی، برخوردار نے ایک نہایت چھت پھاڑ قسم کی چیخ بلند کی، اِس چیخ کے جواب آں غزل کے طور پر ایسی چیخوں کی بازگشت سنائی دی جیسے پیرس پر جرمن حملہ آور کی آمد پر وہاں کے لوگ چیخ اُٹھے تھے۔

بچہ بھی اسی جرمنانہ انداز میں مدافعت کر رہا تھا، نائی کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی کہ وہ بچے کے نزدیک بھی جا سکے۔

''میرا خیال ہے کہ آپ تشریف لے جائیں!'' نائی نے مجھ سے کہا ''شائد آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے بچے کو سکون آ جائے اور یہ آپ کا بچہ بن کر بال کٹوانے پر آمادہ ہو جائے۔۔۔ ایسا کیجئے کہ آدھے گھنٹے بعد تشریف لے آیئے گا۔۔۔!!''

اب تک جتنی باتیں نائی نے کی تھیں، اُن میں یہ واحد عقل والی بات تھی۔۔۔ میں نے ''لاوائس پریزے'' رسالے کی کاپی تھامی اور دوکان کے قریب ایک کافی شاپ میں گھس گیا۔ کافی کی چسکیوں کے درمیان حیا باختہ رسالے کی ورق گردانی کا اپنا ہی مزا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نائی کی دوکان میں واپس لوٹا۔ نائی اپنا کام دکھا چکا تھا۔ بچہ مسکرا رہا تھا اور خاصا خوش اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔

''تم نے اِسے رام کیسے کر لیا؟''

''بہت سے طریقے ہیں'' ۔۔۔ نائی دانت نکالتے ہوئے بولا۔

میں نے بچے کو جیکٹ پہنائی اور پھر بل کی ادائی کی بات کی۔

''اکیس سو فرانک!'' ۔۔۔۔ نائی نے بڑے آرام سے کہا۔

''اکیس سو فرانک۔۔۔ یعنی پورے پانچ ڈالر؟'' ۔۔۔ میں بچے سے بھی زیادہ حلق پھاڑ کر چلایا۔۔۔ ''صرف بال کاٹنے کے؟؟''

''حجامت کے، شیمپو کے، مساج کے اور ہیئر آئل لگانے کے۔۔۔ زیادہ ہیں کیا؟؟؟''

''تم سے یہ سب کچھ کرنے کو کس نے کہا تھا!''

''میں نے بچے سے پوچھا تھا، اس نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے کر دو، میں کیا کرتا پھر؟''

میں بچے کو گھسیٹتا ہوا دوکان سے باہر لایا اور وہ مجھے کشاں کشاں کھلونے کی دوکان پر لے گیا۔ کھلونے کے ساتھ ساتھ مجھے اُس کو نارنجی کا جوس بھی پلانا پڑا۔ بچے کی حجامت، کھلونا اور دیگر منسلکہ اخراجات مجھے لگ بھگ ساڑھے دس ڈالر پڑے، جو محض ایک بچے کی حجامت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بہت زیادہ ہیں۔ گویا بچے کی حجامت سے زیادہ میری حجامت ہو گئی تھی۔

سید عارف مصطفٰی

اُف یہ کتے

کچھ دنوں سے میں چند ناہنجار کتوں کو بہت مرغوب ہو گیا ہوں، رات گئے گھر آتے ہوئے یک بیک پانچ سات کتے نجانے کہاں سے لپکتے لڑھکتے آن موجود ہوتے ہیں اور ان میں سے چند تو مجھے یہاں وہاں سے چکھنے کے زبردست آرزومند بھی معلوم ہوتے ہیں، دو تو بلحاظ صحت ایسے ہیں کہ اگر انہیں گوندھ کر ملایا جائے تب بھی ایک قابل لحاظ کتا نہیں بن پائے گا۔۔۔لیکن سب سے زیادہ جوشیلی پرفارمنس بھی اُنہی کی ہوتی ہے۔۔۔ دُم اٹھائے اور زبان لٹکائے ہر طرف سے کانپ رہے ہوتے ہیں، سمجھ نہیں آتا کہ ڈیڑھ پاؤ کے کتے میں بھی اتنی من بھر بھونک کہاں سے سما جاتی ہے، زیادہ تر تو سیفٹی اسٹینڈرڈز سے آگاہ ہیں اور پتھر پڑنے کی رینج سے ذرا پرے پرے ہی رہتے ہیں جو ناسمجھ ہیں وہ محض ایک پتھر اچھالتے ہی چیاؤں چیاؤں کرتے گلی کا موڑ مڑ جاتے ہیں اور باقیماندہ چیاؤں چیاؤں کا کورس وہاں کھڑے رہ کر پورا کرتے ہیں، پھر میرے آگے بڑھ جانے کے بعد دوبارہ چند قدم آگے آ کر اپنی بہادری کا وہ واویلا کرتے ہیں کہ مجھے کان لپیٹتے ہی بنتی ہے تاہم یہ ضرور ہے اِن کتوں کی مسلسل نگہبانی اور خاص توجہ کی وجہ سے میرے گھر پہنچنے کا سفر آج کل بہت تیزی سے طے ہو جاتا ہے۔۔۔لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ یہ کتے میرے گلے کیوں آئے ہوئے ہیں اِن کے اہداف کیا ہیں اور ان کا منشور کیا ہے، لیکن بظاہر تو سبھی کا ون پوائنٹ ایجنڈا یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں خود کو رضاکارانہ طور پہ اُن کے منہ کے ذائقے کی تبدیلی کے لئے پیش کر دوں اور اُن کی اِس خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں تو ہرگز تیار نہیں۔

بات یہ نہیں کہ میری اِن کتوں سے کوئی پرانی دشمنی ہے، مطلق نہیں،، ویسے بھی دشمنی کرنے کے لئے دشمن کو پہچاننا ضروری ہے اور میرا یہ حال ہے کہ سارے رنگوں کے کتے ایک ہی جیسی شکل کے نظر آتے ہیں یعنی کوئی کالا کتا سبھی کالے کتوں جیسا معلوم ہوتا ہے اور کوئی مٹیالے رنگ کا کتا اسی رنگ کے دیگر ہم جنسوں کی مانند نظر آتا ہے اور ایک کم سے کم فاصلے کی میری مقررہ حد عبور ہو جانے کے بعد تو ہر کتا مجھے بہت ہی کتا معلوم ہوتا ہے۔۔۔ لیکن یہ نہیں کہ میں کتوں کو پہچاننے کی مطلق کوئی حس ہی نہیں رکھتا، میں کتوں کو صرف دو اقسام سے پہچانتا ہوں یعنی اصیل کتا اور رذیل کتا، اصیل کتے کو آپ کتوں کی اشرافیہ سمجھئے، وہی تام جھام یعنی گلے میں خوبصورت سا پٹہ، شیمپو سے دھلا دھلایا، بھرا بھرا پیٹ، چال میں تمکنت، اداؤں میں نخوت اور تھوتھنی پہ بیوروکریٹک سا تدبر اور وقار۔۔۔ یہ جو اصیل کتے ہیں انہیں تو کتا کہتے ہوئے اُن کے مالکان کا دل بھی دکھتا ہے۔۔۔اور کسی چپڑ قناتی کے ساتھ بٹھا دیا جائے تب تو انہیں کتا مانتے ہوئے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایسے اصیل کتے باہر کی سیر فرمانے کا خاص ذوق رکھتے ہیں لیکن ایسے میں اگر اُن کا پٹا ایسے مالک کے ہاتھ ہو کہ جس کی صحت اوسط سے کم ہو تو دیکھنے میں یہی لگتا ہے کہ وہ اس مالک کو سیر کرا رہا ہے۔۔۔ایسے اصیل کتے ہر ایسے ویسے پہ اپنی بھونک ضائع بھی نہیں کرتے، بس ہلکا سا غرا کر ہی کام چلا لیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ کوئی بچہ سامنے ہو تو ایک ہلکی سی 'بخ' یا 'بھوں' ہی کو کافی سمجھتے ہیں، جبکہ رذیل کتے کی ناک پہ اگر مکھی بھی بیٹھ کر اڑ جائے تو چاروں سمتوں میں گھوم گھوم کر تھوتھنی اٹھا کر بھونک بھونک کر آسمان سر پہ اٹھا لیتے

ہیں۔۔۔میں بات کر رہا تھا اصیل کتوں کی تو انہی میں سے ایک قسم ایسے جھبرے و بالدار کوتاہ قامت کتوں کی ہوتی ہے کہ جن کے جسم کا نوے فی صد انکے بالوں پہ مشتمل ہوتا ہے اور قدرت نے ان کے دیگر سب اعضاء کو باقی کے دس فیصد میں ہی ایڈجسٹ کر دیا ہوتا ہے۔۔۔ اِن بالوں کے انبار میں کتے کے آغاز و اختتام کا سراغ لگانا کوئی آسان کام نہیں اور عام طور پہ اس کے منہ کا تعین اسکے بھونکنے سے قبل کرنا خاصا دشوار کام ہے۔

ادھر رذیل کتے کو سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ جو بھی اصیل کتا نہیں وہ اسی قسم دوئم سے ہے اور اس میں جو جتنا بھوکا ہے اور جس قدر بھونکتا ہے اسکے درجات اپنے طبقے میں اتنے ہی برتر ہیں، یہ کتوں کا وہ طبقہ ہے کہ جس کی صرف دو حسیات ہی مسلسل کام کرتی ہیں ایک بھوک کی حس اور دوسری بھونکنے کی حس۔۔۔ بعضے لوگ ایک تیسری حس کا حوالہ بھی دیتے ہیں لیکن اصل میں وہ بھوک کی ذیل میں ہی شمار کی جانی چاہیئے۔۔۔ رذیل کتا اس لئے بھی رذیل سمجھا جاتا ہے کہ وہ لنگی پاجامے اور پتلون پہ یکساں مستعدی سے بھونکتا ہے، تاہم پتلون پہ اگر کوٹ بھی ڈالا ہوا ہو تو آواز میں شدت و خباثت کی مقدار کسی قدر کم پائی جاتی ہے۔۔۔ کچھ کتوں کو قدرت سے مصلحت کوشی فراواں عطا ہوئی ہوتی ہے اور وہ کتا گیری کی حد کو عبور کرنے کی خود سے بھی کوشش نہیں کرتے، لیکن اگر آپ کے ہاتھ میں کوئی مضبوط سا ڈنڈا یا بڑا سا پتھر ہو تو "آن دی اسپاٹ" بھونکنے پہ غرانے کو ترجیح دیتے ہیں اور ایسے میں ان کی غراہٹ میں بھی بڑی عملیت پسندی جھلکتی ہے۔۔۔ جس کا فوری ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ "دیکھ تو میرا بھرم رکھ بھائی میں تیرا لحاظ کروں گا"، تاہم دور سے دیکھنے والے کو بھی بخوبی محسوس ہو جاتا ہے کہ۔۔۔ دونوں طرف ہے ہوا برابر کی لگی ہوئی۔

کہیں اجنبی اور سنسان سی جگہ پہ اگر دو کتے بھی کھڑے ہوں تو نجانے کیوں تین یا چار سے کم نہیں لگتے۔۔۔ لیکن عام جسمانی کیمسٹری کی رو سے اوسان خطا کرنے اور ذاتی جغرافیہ تبدیل کر دینے کے لئے تو ایک کتا بھی کافی سے زیادہ ثابت ہوتا ہے۔۔۔ ایسے موقع پہ اگر آپ نے پہلے سے کوئی دفاعی اوزار نہیں تھاما ہوا تو پھر خود سے کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب جو کرے گا وہ کتا ہی کرے گا۔۔۔ ایک بات مگر عام مشاہدے کی یہ ہے کہ بعضے کتے برائے نام ہی کتے ہوتے ہیں اور صرف سونگھ کر آگے بڑھ جانے پر ہی اکتفاء کرتے ہیں لیکن جب کوئی کتا تنہائی میں مقابل آ جائے تو ایسے مشاہدے پہ انحصار کرنا چنداں مناسب نہیں کیونکہ ہر مشاہدے میں کئی مستثنیات بھی ہوتی ہیں اور کیا پتا آپ کے نصیب میں آنے والے وہ ناگوار لمحات انہی چند مستثنیات کا حصہ ہوں۔۔۔ ایسے میں بس یہی دعا کرنی چاہیئے کہ آپ کو سونگھنے میں مصروف اس کتے کو آپکی بو نا گوار محسوس نہ ہو اور اس کی قوتِ شامہ کو صدمہ نہ پہنچے ورنہ وہ یہ صدمہ آپ کو منتقل کرنے میں دیر نہیں لگائے گا لیکن اس نازک وقت دعا مانگنے سے متعلق ایک مسئلہ یہ بھی تو ہے کہ یہ دعا کرنا یاد کیسے آئے کیونکہ اس مرحلے پہ تو بڑے خطرات ٹالنے والی سادہ سی دعا بھی یاد نہیں آ پاتی اور کوئی بھی کتا اگر وہ واقعی کتا ہے تو اسے کسی بھی وقت کتا پن کرنے سے روکنا تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود چند مسلمہ ناممکنات میں سے ہے۔ اب لے دے کے میرے مسئلے کا حل یہی رہ گیا ہے کہ آتے جاتے ہر وقت میرے ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈنڈا ہو اور اس حلیئے میں جہاں بھی پہنچوں، بہت پہنچا ہوا شمار کیا جاؤں اور فوراً بصد ادب واپس پہنچا دیا جاؤں۔

> شیخ سعدیؒ کو سماع کی مجلسوں میں شریک ہونے کا بہت شوق تھا ان کے استاد علامہ ابنِ جوزیؒ اس چیز کو برا سمجھتے تھے اور شیخ سعدیؒ کو سختی سے منع کرتے تھے، مگر وہ باز نہ آتے تھے
>
> آخر ایک بد آواز قوال سے پالا پڑ گیا، ساری رات اُسی مکروہ صحبت میں بسر ہوئی، جب مجلس ختم ہوئی تو شیخ سعدیؒ نے سر سے عمامہ اتارا اور جیب سے ایک دینار نکالا، پھر یہ دونوں چیزیں قوال کی نذر کر دیں۔
>
> ساتھیوں نے تعجب کیا تو شیخ سعدیؒ نے فرمایا "یہ قوال صاحب کرامت بزرگ ہے، استاد کی نصیحت نے وہ اثر نہیں کیا، جو اس کے "لحنِ داودی" نے کیا ہے اور اب میں سماع سے توبہ کرتا ہوں۔"

خادم حسین مجاہدؔ

درخواست نویسی
(جدید نصاب کے عین مطابق)

کسی سے کچھ مانگنا اور مہذب انداز میں التجا کرنا درخواست کہلاتا ہے۔ جو زبانی بھی ہوسکتی ہے اور تحریری بھی۔ ایک درخواست وہ ہوتی ہے جو ہمارا ملک دوسرے ممالک سے امداد کے سلسلے میں کرتا ہے۔ ایک درخواست وہ ہوتی ہے جو کوئی پٹتا ہوا عاشق مجھ سے کرتا ہے کہ اس بار اسے بخش دیا جائے آئندہ وہ ہر لڑکی کو ماں بہن سمجھے گا۔ ایک وہ درخواست ہوتی ہے جس کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے کہا تھا

دعا منہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

خیر اب نئے دور کے نئے تقاضوں کے تحت ہم آپ کو کچھ نئی قسم کی درخواستوں سے روشناس کروا رہے ہیں۔

پڑوسن کے نام درخواست

بخدمت محترمہ پڑوسن صاحبہ لوسٹوری ولا باسٹریٹ محبت پورہ عشق نگر ضلع رومان

جنابہ عالیہ:

گزارش ہے کہ ہمیں آپکے پڑوس میں آئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا ہے مگر مجال ہے جو کبھی آپ نے تبادلہ خیال کا موقع دیا ہو جب کہ دور دراز سے لوگ آتے ہیں اور فیض پاتے ہیں جبکہ زیادہ حقوق پڑوسیوں کے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی ہم اپنے حلقہ احباب میں آپ کی کمی شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور کیا آپ نے نہیں سنا کہ ''عمر کو سالوں کی تعداد سے نہیں، دوستوں کی تعداد سے گنو'' (یاد رہے ان سالوں سے مراد بیوی کے بھائی ہرگز نہیں) تو کیا آپ نہیں چاہتی کہ آپ کی عمر اور ہماری عمر بڑھ جائے۔ امید ہے کہ میری گزارشات پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔

العارض

عاشق کنوارا

درخواست برائے رخصت بوجہ بیماری

بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی سکول تحت آزارہ

جناب عالی:

بے حساب ادب سے گزارش ہے کہ میں بظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہوں لیکن ریاضی کی کتاب دیکھتے ہی دل میں درد ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ انگلش کی کتاب کھولتے ہی آنکھوں کے آگے اندھیرا

حکمِ حاکم

بجلی جائے تو ٹی وی کیوں بند رہے
کوئی بھی دکھلائیں کرتب کسی بھی صورت
مجھ کو کوئی بھی بچہ روتا نہ ملے
بچوں کو بہلانا ہے اب، کسی بھی صورت

نوید ظفر کیانی

دورہ پڑ جاتا ہے۔اس کے علاوہ روز دس کلو بستے کا وزن اٹھا اٹھا کر دے کی شکایت ہوگئی ہے میرے فیملی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میں تعلیم کی وجہ سے مختلف نفسیاتی عوارض کا شکار ہو چکا ہوں جو روز بروز پیچیدہ صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں لہٰذا ڈاکٹر کا مشورہ یہ ہے کہ مجھے کچھ عرصہ پڑھائی سے دور رہ کر مکمل آرام کرنا چاہیے لہٰذا آپ برائے مہربانی مجھے پانچ سال کی رخصت عنایت فرما دیں تاکہ میں اس دوران مکمل میڈیکل چیک اپ، علاج اور آرام کر سکوں اور صحت یاب ہو کر دوبارہ سکول حاضر ہو سکوں اور اپنی تعلیم مکمل کر سکوں۔

العارض

آپ کا فرمان بردار شاگرد
مدقوق خان بیمار جماعت نہم
رول نمبر صفر صفر سات

درخواست رخصت برائے ضروری کام

بخدمت جناب پرنسپل صاحب گورنمنٹ کالج بیکارستان

جناب عالی!

بے پناہ ادب سے گزارش ہے کہ آج مجھے محلہ کرکٹ کلب کے تحت فائنل میچ میں حصہ لینا ہے اس کے بعد فیشن بازار کا چکر لگاتے ہوئے گرلز کالج کی لڑکیوں کو ان کے گھر چھوڑ کر انٹرنیٹ پر کچھ ضروری ویب سائیٹس چیک کرنا ہیں چونکہ ان ضروری کاموں میں کالج کی حاضری رکاوٹ ہے لہٰذا برائے مہربانی مجھے آج کے دن کی رخصت عطا فرمائیں نوازش ہوگی۔

العارض

فارغ خان رول نمبر 2

حلقے کے ایم این اے کے نام درخواست

بخدمت جناب آکڑ خان صاحب ایم این اے حلقہ نمبر 307

جناب عالی!

گذارش ہے کہ الیکشن کے بعد دو سال ہونے کو آئے اس عرصے میں آپ کی شکل مبارک صرف ایک بار ہی دیکھ سکے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب آپ نے ہیجڑے نچا کر جشن فتح منایا تھا۔ آپ تو دم ستارہ ہو گئے ہیں جو لمبی مدت بعد دکھائی دیتا ہے ویسے آپ فکر نہ کریں اتنا عرصہ گزر جانے کے باعث آپ کے تمام وعدے بھول بھلا چکے ہیں صرف کبھی کبھی اخبارات میں آپ کے بیانات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خدمت خلق کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے البتہ آپ کو بڑی بڑی پارٹیوں اور بیرونی دوروں سے ہی فرصت نہیں ملتی جو آپ اپنے ارادوں کو تکمیل تک پہنچا سکیں ورنہ اب تک تو آپ ہمارے علاقے کو پیرس بنا چکے ہوتے۔ ہماری دست بستہ گذارش ہے کہ ایک بار شکل ہی دکھا دیں تاکہ ہم اسے بھول ہی نہ جائیں آخر کو آپ نے اگلے الیکشن میں

کھڑے ہونا ہے ویسے آپ فکر نہ کریں اس طویل غیر حاضری پر آپ کو کچھ نہیں کہا جائے گا اس لئے محافظ لانے کی ضرورت نہیں۔

العارض

ووٹر اہل حلقہ نمبر 307

درخواست برائے کریکٹر سرٹیفکیٹ

بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی سکول جھابڑا

جناب عالی!

گزارش ہے کہ میں نے آپ کے زیر سایہ جماعت ششم تا دہم تعلیم حاصل کی اس دوران میں نے ہر قسم کی شرارت کرنے کی کوشش کی اور اس پر بڑی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اساتذہ کی کرسیوں کی ٹانگیں توڑنے، چاک ضائع کرنے، چھڑی غائب کرنے، سائیکلوں کی ہوا نکالنے، ہم جماعتوں کے بستے جوہڑ میں پھینکنے، قبل از وقت چھٹی کی گھنٹی بجانے، رجسٹر پھاڑنے، اسمبلی میں بلی کی آوازیں نکالنے اور کلاس میں گانا گانے جیسی شرارتیں میرا روزمرہ کا معمول رہا، میں سکول میں کبھی پابندی سے حاضر بھی نہیں رہا، امتحان ہر دفعہ بذریعہ کارتوس پاس کیا اس کے علاوہ بھی کبھی کسی نیک کام میں ملوث نہیں ہوا۔ اب میں کالج میں داخل ہونا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے میٹرک بھی دھونس دھاندلی سے پاس کر لی ہے لہٰذا آپ مندرجہ بالا امور کا تصدیقی سرٹیفکیٹ جاری کر دیں تا کہ مجھے کالج میں داخل ہونے اور اسٹوڈنٹ لیڈر بننے میں آسانی ہو، امید ہے کہ آپ پہلی فرصت میں میرا کام کر دیں گے ورنہ آپ کی گاڑی......؟ آگے آپ خود سمجھدار ہیں۔

العارض

شرارت بابو رول نمبر 10

درخواست برائے فیس دگنی

بخدمت جناب ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی سکول غریب آباد

جناب عالی!

ڈھائی من ادب سے گزارش ہے کہ میرے والد صاحب بفضل تعالیٰ زندہ ہیں اور ایک ایسے محکمے میں ہیں جہاں اوپر نیچے آگے پیچھے آمدنی ہی آمدنی ہے چونکہ اتفاق سے میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، اس لئے وہ ہر ماہ میری فیس دگنی ادا کرنا چاہتے ہیں تا کہ مجھے سکول میں کچھ خاص سہولتیں میسر ہو جائیں اور امتحان کے دوران ہر قسم کی غیبی امداد مل سکے اس کے علاوہ آپ اگر میرے غیر حاضر ہونے کے باوجود حاضری لگانے کو تیار ہوں تو میرے والد صاحب تین گنا فیس بھی ادا کر سکتے ہیں اگر میری شرارت یا کام نہ کرنے کی سزا کسی غریب مسکین کو دینے کا وعدہ کریں تو آپ کی خدمت الگ سے بھی کی جا سکتی ہے امید ہے کہ میری گزارشات پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔

العارض

آپ کا نازبردار رول نمبر 420

دو مہینے ادھر کی بات ہے ہمیں اپنے دانت نکلوانے تھے ویسے کراچی میں دانت نکلوانے کی ضرورت نہیں پڑتی، دانت تو دانت یہاں آنت بھی آسانی سے نکل جاتی ہے، پھر ٹریفک کا انتظام اور سڑک کا اہتمام کچھ اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ دانت نکلوانے کی حاجت ہی نہیں ہوتی، خود ہی نکل جاتے ہیں۔ ہاں تو ہم ڈین اینڈ ڈین کے ہاں دانت نکلوانے گئے۔ڈاکٹر ڈین نے ہمارا دانت بہت غور سے دیکھا اور پھر ہمیں دیکھا اور پھر دانت دیکھا اور پھر ہماری داڑھ میں انجکشن لگایا اور پھر دو بیٹھکیں لگائیں اور پھر وہ اچھل کر ہماری گود میں بیٹھ گئے۔ پیچھے سے ایک صاحب نے ہمارا سر پکڑا اور ہم نے زنبور کو اپنے منہ میں جاتے دیکھا۔ اور اُس کے بعد کیا ہوا، ہمیں پتہ نہیں۔ جب ہم ہوش میں آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کچھ پڑھ پڑھ کر ہم پر پھونک رہے ہیں۔

ڈاکٹر ڈین اینڈ ڈین سے دانت نکلوانے کے بعد اب ہم جب بھی کسی ڈاکٹر سے اپنا دانت نکلواتے ہیں تو یہ ضرور پوچھ لیتے ہیں:

دانت نکالتے وقت آپ کہاں بیٹھتے ہیں؟

آپ کے ہاں سر پکڑنے کا دستور تو نہیں ہے؟

کیا آپ کو یٰسین شریف زبانی یاد ہے؟

آپ وہی دانت نکالتے ہیں جو دانت والا نکلواتا ہے یا اپنی پسند کا دانت نکالتے ہیں؟

(بات سے بات از نصر اللہ خان)

سید ظفر کاظمی

بھاگ میری بلبل

میں اور قاضی راولپنڈی جا رہے تھے مندرہ سے کچھ دور آگے لگی ایک ھائی ایس کے پیچھے لکھا تھا ''بھاگ میری بلبل''۔ قاضی کو اِس بات پر سخت اعتراض ہوا کہ بلبل کو اس ھائی ایس سے تشبیہہ دی گئی ہے جس میں مختلف سواریاں ہیں اور یہ بھی کہ بلبل ایک اڑنے والا پرندہ ہے جسے یہ بھائی بھگا کر لے جا رہا ہے۔ اِس سے آگے ایک بس پر لکھا تھا'' اگ لاری بم ڈراوَر''۔

اِن گیس والی گاڑیوں پر تو لکھا ہونا چاہیئے 'بم لاری اگ ڈراوَر'!۔۔۔ قاضی بولے۔

ہم نے انھیں سمجھایا کہ اس محکمے کی باتوں پر زیادہ غور مناسب نہیں۔ یہ کچھ بھی لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ھمارے چکوال میں عموماً ایسا نہیں ہے جس پر انہوں نے ایک ٹرک کی طرف اشارہ کیا جس سے کچھ مریل سی بھینسیں محوِ نظارہ تھیں اور نیچے لکھا تھا ''دیدارِ شوق چکوالیاں دا''۔

تو دوستو ذکر ہو رہا تھا بلبل کا۔ ھمارے نزدیک بلبل ایک مظلوم پرندہ ہے جسے بالخصوص ادبی لوگوں نے بہت دکھ پہنچائے ہیں، شاعروں نے تو پتہ نہیں اُن سے کیا کیا منسوب کر رکھا ہے۔ میر صاحب نے تو ان سے غزلیں تک پڑھوا ڈالیں۔ ایک بڑے شاعر نے ایک داستان بیان کی جس میں ایک بلبل نے ایک لڑکے کی محبت بچانے کیلئے ایک کانٹا اپنے سینے میں چبھو کر اپنے خون سے ایک گلِ سرخ تیار کر کے اس کو دیا تا کہ وہ اپنی محبوبہ کا مطالبہ پورا کر سکے، جس نے ایسے موسم میں فرمائش کی جب موسمِ گل نہیں ہوتا۔ بعد میں ایک دوست نے بتایا کہ اس علاقے میں بلبل ہوتے ہی نہیں جس میں یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ محبوبوں کے تو کام ھی عجیب ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی بات کسی بلبل سے منسوب کرنا بھی زیادتی ہے جو اس نے کی ہی نہ ہو۔

حکماء نے بلبل کی کچھ خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کی یہ تیسرے درجہ میں گرم خشک ہے جس کی بنا پر یہ سرد ترین علاقوں میں سے کچھ ایسی جگہوں میں پایا جاتا ہے جہاں گُل کھلتے ہوں اور یہاں گرم علاقوں میں جو کلغی دار نظر آتے ہیں جنگی مشابہت بلبل سے ہے یہ وہ نہیں۔ اس طرح گرم علاقوں میں جو کلام ان سے منسوب ہے وہ مستند نہیں کیونکہ ان علاقوں میں وہ پائے ہی نہیں جاتے۔ نہ بلبلوں کو اس کا علم ہے۔ بلبل کو ھزار داستان بھی کہا گیا ہے۔ کیونکہ بقول محیط، وہ اتنی قسم کے سر نکالتی ہے۔ اس سے بات سمجھ آئی کہ ھمارے ہاں کی جعلی بلبلیں کیوں ایک قسم میں ہی بولتی ہیں۔ بلبل کو ہم نے اپنے مضمون میں مذکر اور مونث بھی کہا ہے کیونکہ یہ دونوں طرح کے ہیں۔ کہتے ہیں کہ درجہ اول کا اوپری رنگ سیاہ اور سینہ بھورا ہوتا ہے اور دم ابتدا میں نیچے سے سرخ اور باقی سیاہ اور بھورا رنگ ملی ہے۔ ابنِ صفی نے شائد اسی بنا پر ایک کالی خاتون کی سرخ لپ سٹک دیکھ کر کہا تھا کہ بلبل اُلٹ گیا ہے۔

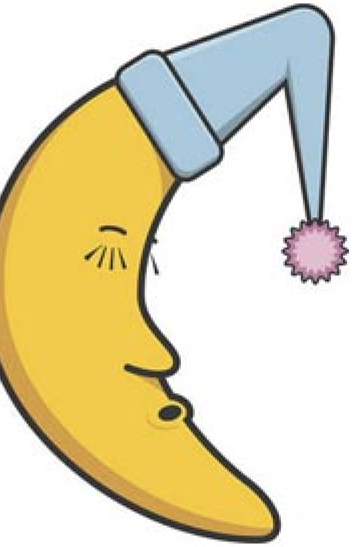

جمیل خان

باسی، اُباسی اور باس مارتی عید

آج باسی عید ہے، لیکن اب تو یہ دیرینہ (یاد آیا کہ ایک ایم اے پاس بدسلیقہ شعار خوبصورت خاتون نے ہم سے دیرینہ کا مطلب پوچھا تھا، ہم نے تلملا کر جواب دیا تھا کہ یہ کرینہ کی چھوٹی بہن کا نام ہے) روایت بن چکی ہے کہ عید کا دن بھی کراچی میں اُباسی سے بھرپور ہی گزرتا ہے، اس لیے کہ چاند رات کو رات بھر خریداری کی جاتی ہے اور پھر عید کی نماز کے بعد سارا دن سوتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ شام ہوتے ہی ہڑبڑا کر نیند سے جاگنے والے لوگ شہر کی سڑکوں پر یہ عہد کر کے نکل پڑتے ہیں کہ کسی کو بھی راستہ نہیں دیں گے۔ چنانچہ کراچی کی سڑکوں پر گھنٹوں ٹریفک جام میں حبس زدہ گھٹن سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس دوران اگر ڈاکو بھائی بھی نیند سے جاگ جائیں تو یہ لطف دوچند ہوسکتا ہے کہ لُٹ جانے کا بھی لطف شامل ہوجاتا ہے۔

ہمیں نہ تو چاندرات کی خریداری کی روایت سمجھ میں آسکی ہے اور نہ ہی چاندرات......!

حضرت بھگت کبیر کہہ گئے ہیں کہ:

رنگی کو نارنگی کہیں، تتنت مال کو کھویا
اُلٹی ریت جگ کی پائی، دیکھ کبیرا رویا

گو کہ بھگت کبیر کو گزرے صدیاں بیت گئیں، لیکن ہماری قوم کا حال اب بھی وہی ہے، یعنی چلتی کو اب بھی گاڑی (یعنی گاڑدی) کہتے ہیں اور دودھ سے حاصل ہونے والے جوہر کو کھویا (یعنی کھودیا) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح جس روز چاند ابروئے یار کی مانند باریک سی صورت لے کر کچھ لمحوں کے لیے نمودار ہوتا ہے اور ہمیں رات کی تاریکی میں چھوڑ جاتا ہے، تو ہم اس رات کو چاندرات کہتے ہیں!

چاندرات کا عنوان چھوٹی اور بڑی عید کی پہلی رات کو دیا گیا ہے، بڑی عید کی چاندرات تو پھر بھی چاندرات ہوتی ہے، کہ دس تاریخ کا چاند آسمان کو کسی حد تک روشن کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن عیدالفطر کی پہلی رات، کہاں سے چاندرات ہوگئی؟

بیمہ ایجنٹ

آپ کا کہنا بجا ، یہ عالمِ بالا سبھی
اِس جہاں کے باسیوں کو فکرِ مستقبل کہاں
احتیاطاً اِس لئے لایا ہوں بیمہ کاغذات
جانے کب ترغیب میری رنگ لے آئے یہاں

نوید ظفر کیانی

تہوار ہوں یا شادی بیاہ، عموماً ہمارے ہاں ہر کام اس وقت ہی یاد آتے ہیں، جبکہ تہوار یا تقریب عین سر پر آن پہنچتی ہے۔ ایک گھرانے کو میں چالیس سالوں سے دیکھ رہا ہوں، چالیس برس پہلے ان کے ایک فرد کی برات کی روانگی کا وقت ہو رہا تھا اور خواتین سلائی مشین پر جھکی شلواروں کی سلائیاں کر رہی تھیں۔ آج بھی اس گھرانے کا یہی حال ہے۔ سارے کام عین وقت پر ہی یاد آتے ہیں اور عین وقت پر ہی افراتفری میں انجام پاتے ہیں، اور اگر یاد بھی ہوں تو انہیں ٹال ٹال کر اس وقت تک پہنچا دیا جاتا ہے۔

اگر غور کریں تو ہماری حکومتیں قیامِ پاکستان سے یہی کچھ کرتی آ رہی ہیں۔

لیکن تہوار عین سر پر آجائے اور اس کی تیاری شروع کی جائے، اس میں معذرت کے ساتھ ہمارے ملک کی 'کتی نسل' کی

کمپنی سرمایہ داری کا ہاتھ زیادہ ہے۔ سیٹھ، ساہوکار، صنعتکار، تاجر اور کاروباری افراد اپنے ملازمین کو ان کا محنتانہ عین عید بقرعید کے موقع پر ہی دیتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے اداروں میں بھی ملازمین کو عیدین پر بونس دینے کا رواج تھا۔ اس طرح معمول کے اخراجات کے علاوہ بھی کچھ رقم غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے ہاتھ میں آجاتی تھی۔

لیکن اب اس کا رواج بڑے بڑے اداروں میں بھی نہیں رہا ہے۔ اگر کسی کے اخراجات زیادہ اور تنخواہ کم ہو تو پھر اس کے پاس ان تہواروں کے اخراجات کے لیے علیحدہ سے رقم نہیں ہوتی۔ اس کے لیے کمیٹیاں ڈالی جاتی ہیں، یا کسی اور طریقے سے پس انداز کیا جاتا ہے، بعض لوگوں کے لیے یہ بھی ممکن نہیں ہو پاتا۔

مہنگائی اپنے عروج پر ہے، اور اس کا عروج اس قدر ہے کہ جو لوگ بیرون ملک مقیم ہیں، وہ اس کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔

کراچی میں تو مہنگائی کی ایک اہم وجہ بھتہ مافیا ہے، جس میں پولیس سے لے کر بجلی کے محکمے والے سب ہی دامے درمے سخنے شریک ہیں۔

یہ جو جگہ جگہ پولیس چوکیاں بنی ہوئی ہیں، ان کا مقصد نہ تو عوام کی حفاظت ہے نہ ہی ان سے سرکاری املاک کی حفاظت مقصود ہے۔ بلکہ یہاں سے شہر میں آنے والے پھلوں، سبزیوں، اناج اور دیگر اشیائے ضرورت سے لدے ٹرکوں کو روک کر ان سے اپنا 'حق' وصول کیا جاتا ہے۔

بجلی کے محکمے کے کرتا دھرتا رمضان کے آخری عشروں کے دوران مارکیٹوں میں اچانک معمول سے ہٹ کر طویل لوڈشیڈنگ شروع کر دیتے ہیں یا پھر مستقل دو تین دن تک بجلی بند کر دی جاتی ہے۔ پھر ان مارکیٹوں سے فی تاجر ہزاروں روپے اکھٹا کر کے بجلی کے محکمے کے کرتا دھرتاؤں کی خدمت میں پیش کر دیا جائے تو بجلی بحال ہو جاتی ہے۔

یوں تو اب بیشتر مارکیٹوں اور شاپنگ سینٹروں کے پاس اپنے ہیوی جنریٹرز ہیں، لیکن انہیں مستقل نہیں چلایا جا سکتا، دوسرے ان سے بجلی کا حصول کافی مہنگا بھی پڑتا ہے، اور تیسرے یہ کہ ان ہیوی

جنریٹرز کی تنصیب پرسٹی گورمنٹ کو ماہانہ ٹیکس بھی دینا پڑتا ہے، نہ دیا جائے تو وہ پولیس کے ساتھ آتے ہیں اور جنریٹر ٹرک پر رکھ کر لے جاتے ہیں۔

ان کاروباری اور تاجر پیشہ حضرات کو علاقے پر غلبہ رکھنے والی سیاسی جماعت کو بھی صدقہ خیرات دینا پڑتا ہے، جو ان کی حیثیت کے حساب سے ہوتا ہے اور اس کا تعین پہلے سے کر کے انہیں پرچیاں پکڑا دی جاتی ہیں۔

کراچی میں اردو بولنے والوں کی اکثریتی آبادی کے تاجر ہوں یا چھوٹے صنعتکار یا ہنرمند اگر ان کا کام ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے تو پھر سمجھ لیجیے کہ ان کا سر پھر ایسی اوکھلی میں ہے جس میں اوپر نیچے دائیں بائیں، چہار اطراف سے موصل کی ضرب پڑتی رہتی ہے۔ یعنی کہ کراچی میں دیگر قومیتوں کی ہدیہ شکرانہ وصول کرنے والی تنظیمیں اردو بولنے والوں کے اکثریتی علاقوں میں بھی بھرپور رسائی رکھتی ہیں، انہیں غالب تنظیم یا جماعت روکنے کی جرأت نہیں کر پاتی، اس لیے کہ ان کا زور صرف اپنی ہی برادری یا پھر اپنی آبادی میں موجود تاجروں یا صنعتکاروں پر ہی چل پاتا ہے۔ دیگر قومیتوں کی اکثریتی آبادی میں جھانکنے کو تو چھوڑیے ان کے وصولیوں کو روکنے کی بھی ہمت نہیں ہے ان میں۔

چنانچہ اردو بولنے والی اکثریتی آبادی کے صنعتکاروں، تاجروں اور کاروباری افراد سے کئی کئی ہاتھ ہدیہ شکرانہ وصول کر لیتے ہیں۔

جب انہیں اتنی بڑی بڑی رقمیں یوں دینی پڑیں گی تو سوچیے کہ وہ اس کو فروخت کی جانے والی اشیاء یا سروسز کی قیمت میں نہیں شامل کر دیں گے؟

ظاہر ہے، اس طرح جو چیز دس سے تیس روپے تک کی فروخت ہونی چاہیے، اس کی قیمت 100 روپے تک جا پہنچے گی۔

ہدیے شکرانے کا سلسلہ ایک تو یہ ہے کہ زبردستی وصول کیا جاتا ہے، جس ایک ہلکی سی جھلک مندرجہ بالا سطور میں آپ نے ملاحظہ کی، اس کا ایک اور سلسلہ ہے جو نارِ جہنم کا خوف اور جنت کی حوروں کا لالچ دے کر طلب کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں سیٹھوں، ساہوکاروں، صنعتکاروں، تاجروں وغیرہ کی اکثریت اپنی حرامخوریوں پر پردے ڈالنے کے لیے بھی ازخود ان ہدیوں شکرانوں کی ادائیگی کرتی ہے۔ لاکھوں روپے مساجد کی تزئین و آرائش پر خرچ کیے جاتے ہیں، میلاد و مجلس شریف میں مدعو کیے گئے نعت خوانوں و نوحہ خوانوں اور واعظین کو لاکھوں روپے دیے جاتے ہیں۔ مذہب کے نام پر قائم ٹرسٹوں کو ماہانہ لاکھوں ادا کیے جاتے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اپنے منافع میں سے ہرگز خرچ نہیں کیا جاتا، بلکہ یہ سب کا سب قیمت فروخت یا خدمات کی قیمت میں شامل کر کے عوام سے ہی وصول کیا جاتا ہے۔

میں نے ایسے سیٹھ بھی دیکھے ہیں، جو صبح سے شام تک دکان یا دفتر میں آنے والے بھکاریوں کو دس دس، پانچ پانچ روپے کر کے کئی سو روپے خرچ کر دیتے ہیں، لیکن بارہ بارہ گھنٹے کام کرنے والے ملازمین کو محض آٹھ سے بارہ ہزار تنخواہ دیتے ہیں۔ اس دوران وہ بیمار ہو جائیں یا کسی حادثے کا شکار ہو جائیں تو ان کا کوئی پُرسان حال نہیں ہوتا۔ رمضان اور عید، بقرعید بھی ایسے لوگوں کے لیے کسی حادثے سے کم نہیں ہوتی۔ بلکہ رمضان تو ان کے لیے آئی سی یو کے مترادف ہوتا ہے کہ سارا مہینہ گویا نزع کے سے عالم میں گزرتا ہے۔

ایسی آبادیاں جہاں کم آمدنی رکھنے والے افراد مقیم ہوں تو چیزوں کے دام ایک حد تک بڑھائے جا سکتے ہیں، اس کا حل تاجر برادری نے یہ نکالا ہے کہ ان آبادیوں میں انتہائی گھٹیا اور غیر معیاری چیزیں فروخت کی جاتی ہیں۔ ریپر اور پیکنگ اصل برانڈ کی یا تو ہوبہو نقل ہوگی، یا پھر اس سے ملتی جلتی۔ اس کے علاوہ کاؤنٹر سیل کا رجحان بھی ہے، یعنی جس پر دس گنا منافع ملتا ہو، وہ چیزیں گاہک پر مسلط ہو کر فروخت کر دی جاتی ہیں۔ یا پھر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ مذکورہ برانڈ کی چیز شارٹ ہوگئی ہے۔

غرضیکہ ایک معاشی چکر ہے، جس کی بنیاد ظلم پر رکھی گئی ہے۔ اس چکر میں کولہو کے بیل بنے عوام کالانعام کے لیے عید باسی ہی ہوتی ہے اور باس مارتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

عامر راہداری

لالچی کتا

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک کتا بہت بھوکا تھا بالکل ہمارے سیاست دانوں کی طرح، پہلے تو اس نے کافی دیر پاکستانی عوام کی طرح صبر کیا لیکن جب بھوک حد سے بڑھی تو جمشید دستی کی طرح رزق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا کتوں کی طرح گلیاں گھومتے گھومتے آخر اسے کافی دور ایک قصائی کی دوکان نظر آئی وہ للچائی نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھا تو دو انسانوں کو دس روپے کی خاطر لڑتے دیکھا اور شکر ادا کیا کہ وہ انسان نہیں ہے اس نے سر جھکا گزر جانا مناسب سمجھا اور قصائی کی دوکان کی طرف چل پڑا قصائی کی دکان تک پہنچتے پہنچتے اس کی بالکل وہی حالت تھی جو ہیڈ آفس سے ہم تک پہنچتے پہنچتے ہماری تنخواہ کی ہو جاتی ہے. آخر کار گھسٹ گھسٹ کر وہ دوکان پر پہنچ کر اس کے آگے غریب ووٹر کی طرح بیٹھ گیا پہلے تو قصائی نے حکمرانوں کی طرح کوئی توجہ دینا مناسب نہ سمجھا پھر اچانک اسے اپنے کاروبار کی عزت کا خیال آیا اور غلیل اٹھا کر ایک بٹا اٹھا کہ کتے کو داغنا چاہا کتا بھی کافی سوشل اور ٹیکنیکل واقع ہوا اور مشرف کی طرح بیماری کا بہانہ بنا کر لوٹنیاں مارنا شروع کر دیں شاید قصائی بھی پچھلے جنم میں کتا رہا ہو اس لئے ترس کھا کر کتے کو کھلے دل سے معاف کر دیا اور بٹا سنبھال کر رکھ دیا (ویسے ہماری کمتر عقل کے مطابق اسے دو روپے کا بٹا ضائع کرنا مناسب نہ لگا اس لئے معافی کا اعلان کیا) خیر قصائی کو شاید شدید قسم کا رحم چڑھا ہوا تھا اس نے کتے کے سامنے اوجھری کا ایک ٹکڑا پھینکا کتا بھی بھرپور کتا تھا اس نے اوجھری کو دیکھ کر یوں منہ بنایا جیسے گاہک چیز پسند نہ آنے پہ بناتے ہیں قصائی کو حیرت ہوئی اور اٹھ کر کتے کے آگے سے اوجھری اٹھا کر پانی سے دھو کر دوبارہ بیچنے والے گوشت میں رکھ دی اور یوں انجان بن گیا جیسے لوگ ادھار لے کر بن جاتے ہیں ۔ کتے کے پیٹ میں آنتوں نے ا، ب ، پ پڑھنا شروع کر دیا(ویسے آنتیں قل ہو اللہ بھی پڑھ سکتی تھیں لیکن کتا بھی فتوؤں سے خوب واقف تھا اس لئے ا، ب، پ سے گزارہ کیا اور توہینِ مذہب سے بچ گیا) اچانک قصائی کی دوکان پہ کچھ کوے اپنا حصہ لینے آئے جنھیں قصائی نے ماں بہن کی گالیوں سے نوازا لیکن کوے بھی کتے کی طرح اس خالص ہندوستانی زبان سے ناواقف تھے اس لئے گالیوں کو نصیبو کے گانوں کی طرح انجوائے کرنے لگے ۔ کتے نے جب قصائی کو کوے بھگانے کی کوشش میں ناکام دیکھا تو سکاٹ لینڈ یارڈ کی طرح اپنی خدمات مفت مہیا کر دیں اور بھوں بھوں کرنے لگا کوے یوں بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانے کو بھونکتے دیکھ کر حیران ہوئے ، کتا بھونکنے میں اتنا جذباتی ہو گیا کہ قصائی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے کوؤں نے دونوں دوستوں (قصائی اور کتا) کی محبت کو دیکھ کر اڑ جانا مناسب سمجھا اور ناراض گرل فرینڈ کی طرح بغیر خدا حافظ کہے چلتے بنے ۔ کتے نے اپنے مشن میں کامیاب ہو کر قصائی کی طرف یوں دیکھا جیسے بھوں بھوں کرنے کے پیسے مانگ رہا ہو ۔ ویسے بھی کتوں کو ایک بھونک پیچھے سے چھ روپے کی پڑتی ہے تو دس روپے کی بوٹی تو اس کا حلالی حق تھا ۔ قصائی نے بھی کتے کی اس بھرپور مدد کے انعام میں حاتم طائی کی قبر کو لات مارتے ہوئے ایک تازہ بوٹی عنایت فرمائی ۔ بوٹی دیکھ کر کتے کے منہ پر ویسی ہی مسکراہٹ آئی جیسی ترقی پذیر ممالک کے وزرائے اعظم کو آئی ایم ایف کا وفد دیکھنے پہ آتی ہے کتا جھٹ

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔۔۔اُس نے نرس سے کہا ''ہمارے ملک میں گھسیاروں کو پکڑ کر ماہرِ تعلیم بنا دیا جاتا ہے۔۔۔اور وہ کم عمر گدھوں پر مختلف قسم کے مضامین کی گٹھریاں لادتے چلے جاتے ہیں۔۔۔ابھی حال ہی میں دوسری جماعت کے ایک بچے سے اس کے نصاب کے متعلق پوچھ بیٹھا تھا۔۔اُس نے بتایا کہ وہ اُردو، انگریزی ،سوشل اسٹڈی،ارتھمیٹکس ، نیچر اسٹڈی۔ اسلامیات، آرٹ اینڈ کرافٹ اور ہائی جین وغیرہ پڑھتا ہے۔۔۔ذرا سوچو تو کیا حشر ہوگا اُس کا۔۔۔کیا وہ بچپن ہی سے ذہنی بدہضمی میں مبتلا نہیں ہو جائے گا۔۔۔کیا اُکتاہٹ اور مایوسی اُس کی زندگی کے جزوِ لازم نہیں بن جائیں گے۔۔۔کیا اُس کی تخلیقی صلاحتیں کند نہ ہو جائیں گی۔۔۔اور پھر کیا مستقبل اُسے محض ایک کلرک بنا کر نہ رکھ دے گا۔۔۔

''آپ شائد کمرشل سروسز کا تذکرہ کر رہے تھے۔۔۔'' نرس نے اسے ٹوکا۔

''وہی ہے، وہی ہے'' عمران سر ہلا کر بولا ''ابھی تک آپ لوگ گانا سن رہے تھے، اب اشتہارات سنیئے۔۔۔قوم کی تعلیم پر زرِ کثیر خرچ کیا جا رہا ہے۔۔۔ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں ایک بھی ان پڑھ نظر نہ آئے۔۔۔سب کے سب منشی فاضل ہو جائیں،اس کے لئے ماہرینِ تعلیم کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو قوم کے لئے بہت اچھی گالف کھیلتے ہیں اور اپنے بچوں کو حصولِ تعلیم کے لئے عموماً سمندر پار بھیج دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر دعاگو از ابنِ صفی

سے آگے بڑھا اور بوٹی اٹھا کر قصائی کا شکریہ ادا کیا اور یوں نخرے سے مڑا جیسے یوٹیلٹی سٹور کی لمبی لائن میں کھڑا کوئی شخص آٹے کی بوری لے کر مڑتا ہے۔ پہلے تو اس نے سوچا اس بوٹی کو چھپا کر رکھ لوں اور دوبارہ قصائی کی مدد کر کے ایک اور بوٹی حاصل کروں لیکن فوراً اِس خالص انسانی سوچ کو ذہن سے جھٹک کر ایک طرف کو چل پڑا اس نے بھی اپنے بڑوں کے لالچ اور بیوقوفی کی کہانی سن رکھی تھی کہ پانی میں اپنا عکس دیکھ کر دوسرا کتا سمجھ کر چھلانگ لگا دیتے تھے اسے آج اپنے جاہل اور "ان سولائزڈ" پرکھوں کے نام سے یہ دھبہ مٹانا تھا اس لئے وہ بھی نہر کی طرف چل نکلا۔ چلتے چلتے آخر کار نہر کنارے پہنچا اور اپنا عکس دیکھنا چاہا لیکن نہر کو دیکھ اس کی وہی حالت ہوگئی جیسے ایک نوجوان کی اپنی تصویر پر صفر لائک دیکھ کر ہو جاتی ہے نہر میں اتنا گند تھا کہ عکس تو دور کی بات، اُسے پانی بھی بڑی مشکل سے نظر آیا۔ اسے مایوسی نے یوں گھیر لیا جیسے حج سے واپس آنے والے حاجی کو رشتہ دار گھیر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ تو اس نے پرکھوں کی عزت پر لعنت بھیجنے کا سوچا پھر پتا نہیں کہاں سے ہمت جمع کی اور پانی کا صاف ٹکڑا ڈھونڈنے نکل پڑا۔ "ہمت کتاں مدد خدا" اُسے ایک صاف جگہ دکھائی دی جہاں وہ اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔اُس نے ہمت باندھی اور پانی کا سامنا کیا اور اپنا عکس دیکھنا چاہا اور حیرت سے مرجانا چاہا کہ کیونکہ اس کی شکل بالکل ڈڈو (مینڈک) جیسی تھی۔ابھی شاید وہ کچھ اور حیران رہتا لیکن شاید ڈڈو کا ترس آگیا اور چھلانگ لگا کر پانی میں گم ہوگیا اور کتے کی سانس بھی واپس آئی کہ وہ خود کو نہیں بلکہ ڈڈو کو دیکھ رہا تھا۔۔۔خیر پانی میں ٹھہراؤ آیا تو اس کی کچھ کچھ شکل واضح ہوئی، اپنی شکل کو دیکھ کر پہلے تو اس نے بالکل ویسا چہرہ بنایا جیسا لوگ سیلفی لیتے ہوئے بناتے ہیں اور پھر اپنا مشن یاد آتے ہی بوٹی کی طرف متوجہ ہوا اور بوٹی کو دیکھتے ہی بے ہوش ہونے لگا کیونکہ وہ بوٹی اس کے اپنے ہی کسی بھائی کتے کی تھی پہلے تو اس کا دل کیا کہ ابھی چھلانگ لگا کر خودکشی کرلے پھر خیال آیا کہ کسی میڈیا والے نے دیکھ لیا تو پوری نوجوان نسل کی عزت خاک میں مل جائے گی اور اسے بھی لالچی اور بے وقوف سمجھا جائے گا۔اس نے ارادہ ترک کیا اور بوٹی اٹھا کر دوبارہ پیچھے مڑا اور گھسٹتا گھسٹتا قصائی کی دوکان پر پہنچا اور بوٹی قصائی کے منہ پر دے ماری پہلے تو قصائی حیران ہوا پھر خوش ہو کر بوٹی اٹھا کر صاف پانی سے دھو کر بیچنے والے گوشت میں رکھ دی۔ کتا شدید غیرت میں واپس مڑا اور نہر میں جا کر چھلانگ لگا دی۔

کہتے ہیں کہ قصائی نے اس غیرت مند کتے کی لاش کو بھی پانی سے نکال کر بیچ دیا تھا۔۔۔واللہ عالم بالصواب۔

حماد احمد، لاہور

اِستری

انتہائی مضبوط اعصاب اور دل و جان کے مالک شخص کو عام طور پر ''آئرن مین'' یا مردِ آہن کہا جاتا ہے۔ خواتین کو بھی ایک لحاظ سے ''آئرن مین'' کہا جاسکتا ہے۔ وہ ایسے کہ خاتون کو انگلش میں ''فی میل'' کہا جاتا ہے۔ فی میل کا ''Fe'' ایف ای سے لکھا جاتا ہے۔ چونکہ آئرن یعنی لوہے کا کیمیائی نام بھی ''Fe'' ہی ہوتا ہے، لہذا ''فی'' میل کو بھی با آسانی ''آئرن مین'' کہا جاسکتا ہے۔۔

اسی طرح کسی کپڑے استری کرنے کے مقابلے میں جو ''بندہ'' زیادہ کپڑے ''استری'' کرلے اسے بھی ''آئرن مین'' ہی کہا جاتا ہے۔ دراصل استری کو انگلش میں آئرن ہی کہا جاتا ہے۔

بل کئی چیزوں پر پڑ سکتے ہیں چاہے کپڑوں پر ہوں، ماتھے پر ہوں یا رسی پر ہوں۔ عام طور پر اگر رسی جل بھی جائے تو اس کے بل نہیں جاتے لیکن استری کرنے سے کپڑوں کے بل ضرور چلے جاتے ہیں۔ بلوں والا پراٹھا بلاشبہ سادے پراٹھے کی نسبت زیادہ مزے کا ہوتا ہے لیکن بل والے کپڑے کبھی بھی اچھی طرح استری شدہ کپڑوں کی نسبت اچھے نہیں لگتے۔ جس شخص نے استری کیے بغیر ہی کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہوں، اس سے اگر ایسا کرنے کی وجہ دریافت کی جائے تو جواب ملتا ہے کہ جب چہرے پر ہی بے تحاشا جھریاں پڑی ہوئی ہوں تو ایسے میں کپڑوں پر ''جھریاں'' پڑ جانے سے کیا مصیبت پڑ جائے گی۔

اس کے برعکس بہت سے لوگ استری کرنے کے معاملے میں بہت ہی حساس واقع ہوتے ہیں۔ بجلی موجود نہ ہو تو ایسے لوگ پانی بھری کیتلی یا ساس پین کو گرم کر کے کپڑوں پر انتہائی عمدگی سے پھیرتے ہیں۔ جب ساس پین کو منہ سے پکڑ کے کپڑوں پر پھیرا جا رہا ہو تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی سٹریتھوسکوپ سے کپڑوں کا سانس چیک کیا جا رہا ہو۔ استری کے شوقین لوگ خاصا ادبی انداز گفتگو اختیار کرتے بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر عید سے قبل چاند رات کو ان سے پوچھ لیا جائے کہ: ''آپ کو کچھ چاہئے ہو تو بتایئے''۔۔۔ بڑے ادب سے جواب دیتے ہیں کہ: ''آپ نوازنے پر آئے ہی ہوئے ہیں تو ہمیں صرف اور صرف استری اور ٹیبل ہی خالی چاہئے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے''۔

جس طرح مکتبِ عشق میں سبق یاد کرنے والے کو چھٹی نہیں ملا کرتی بالکل اسی طرح جس شخص نے اپنے کپڑے خود ہی استری کرنا ہوں، اسے اپنی زندگی میں ہمیشہ اس محنت کو انجام دیتے ہی رہنا پڑتا ہے۔ میری امی جان نے ایک بار مجھے نصیحت کی کہ کپڑے ایک ہی مرتبہ استری کر کے الماری بھر دینی چاہئے، یوں بار بار کی تکلیف سے نجات مل جاتی ہے۔ مجھے محسوس ہوا کہ یہ کام تو انتہائی آسان ہے، ایک بار کی پریشانی اور پھر ہمیشہ کی شادابی۔ اسی وقت نصیحت پر عمل کیا مگر ایک ہی ہفتے بعد الماری کو چیک کرنے سے معلوم ہوا کہ ساری محنت ''کامیابی سے ضائع'' ہو چکی

تھی ۔ ایک بھی استری شدہ سوٹ باقی نہیں بچا تھا۔ یوں دوبارہ کبھی اس کام کی ہمت نہیں ہو پائی۔

استری شدہ کپڑوں کو عام طور پر الماری کے اندر لٹکایا جاتا ہے۔ لیکن کئی شوقین حضرات سخت گرمیوں میں کپڑے استری کر کے فریج کے اندر لٹکا دیتے ہیں۔ یوں ایک تیر سے دو شکار ہو جاتے ہیں۔ استری بھی برقرار رہتی ہے اور ٹھنڈا ٹھار لباس زیب تن کرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔

استری بہت زیادہ بجلی کھینچتی ہے۔ اسی لئے گھروں کے بڑے لوگ "پرائم ٹائم" یعنی شام چھ سے رات دس بجے تک استری کو کم سے کم استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دراصل اس دوران بجلی کے ایک یونٹ کی قیمت دوگنا ہوتی ہے اور استری چلانے سے یونٹ بھی اس قدر تیزی سے گرتے ہیں جیسے ان کے پیچھے کوئی "تجربہ کار پالتو کتا" لگ گیا ہو۔ یوں معمولی سی بداحتیاطی سے مہینے کے بعد بل کا اژدھا آ کے حیران و پریشان کرسکتا ہے۔ بقول شاعر:۔

فرج ہو استری، اے سی ہو یا ہیٹر
لگائیں تار تو میٹر گھوم جاتا ہے
مہینے بعد بل جب سامنے آئے
پھر سے اک بار میٹر گھوم جاتا ہے

استری کی اہمیت گھر کے اندر بھی بہت ہوتی ہے اور اہل محلہ یعنی اڑوس پڑوس میں بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گھر کے اندر استری کی اہمیت یوں ہوتی ہے کہ ہندی زبان میں بیوی کو استری ہی کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ایک واقعہ مشہور ہے کہ ہندوستان میں ایک صاحب کے گھر استری حالات زمانہ کا شکار ہو کر خراب ہوگئی تو وہ اپنے پڑوسی کے گھر سے عارضی طور استری حاصل کرنے پہنچ گئے۔ پڑوسی نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو بولے: "وہ میں یہ کہنے آیا تھا کہ ہماری استری تو خراب ہو چکی ہے تو ذرا آپ کی استری۔۔۔" پڑوسی غصے سے بولے: "کیا ہوا ہماری استری کو؟"۔ ساتھ ہی اپنی اہلیہ، جو کہ تب تک دروازے کے قریب پہنچ چکی تھیں، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: "یہ

دیسی لوگ

کینیڈا میں دیسی اُسے کہتے ہیں جس کے بچے اس سے زیادہ اچھی انگریزی بولتے ہوں۔ جو بس اور ٹرین میں سفر کرتے ہوئے کتاب نہیں چہرے پڑھتا ہے۔ جو تقریبات میں ریڈ وائن پیتا ہے اور کھانے کے لیے حلال چکن ڈھونڈتا ہے۔ امیر اور پرانا دیسی وہ ہوتا ہے جو گرمیوں میں میلے ٹھیلے لگاتا ہے اور اپنے کونسل جنرل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تصاویر کھنچواتا ہے۔ کینیڈا کے انتخابات میں کئی بار "کھڑے" ہو کر "بیٹھ" چکا ہوتا ہے۔ جو نئے دیسیوں کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتا ہے۔ اسے پاکستان کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی پھر بھی پاکستانی بیوی کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ کینیڈا کی مساجد میں حاضری کم اور گروسری اسٹور میں زیادہ ہوتی ہے۔

دیسی لائف اِن کینیڈا از لیلین بیگ

رہی میری استری"۔ پڑوسی گھبرا کر بولا: "میرا مطلب کپڑوں والی استری تھا"۔ جواب ملا: "غور کیجئے یہ بھی کپڑوں والی ہی ہیں"۔ پڑوسی نے کہا "سر وہ والی استری جو کرنٹ بھی مارتی ہے"۔ جواب ملا: "کرنٹ کا تو پتہ نہیں لیکن کرماں والی اگر غصے میں آجائے تو کبھی کبھار غصے سے آنکھوں کی گھوریاں ضرور مارتی ہے"۔

سخت گرمیوں کے موسم میں ایک دن ہمارے گھر کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو ایک اجنبی صاحب کھڑے دکھائی دیئے۔ سلام کرنے کے بعد بولے: "بس میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ کیا آپ کے گھر ویکیوم کلینر موجود ہے؟۔" میں نے کہا "جی ہاں، بالکل موجود ہے"۔ بولے: "گرائینڈر مشین بھی موجود ہے؟"۔ میں نے کہا: "جی ہاں وہ بھی موجود ہے"۔ پوچھنے لگے: "اور استری؟"۔

مجھے "غیر مشدودہ" ہونے کی بنا پر ہندوستان والے واقعے کی طرح پریشان نہیں ہونا پڑا۔ فوری طور پر جواب دیا کہ: "جی ہاں! استری بھی موجود ہے"۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی پوچھ لیا کہ :۔ "آپ یہ سب کچھ کیوں دریافت کر رہے ہیں؟"۔

بولے:۔ میرا نام محمد عرفان ہے۔ آپ کے ساتھ والا گھر

کرائے پر لینے کا ارادہ ہے۔ مگر پہلے ہر طرح سے تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں ہمیں یہاں کسی قسم کی پریشانی اور دقت کا سامنا تو نہیں کرنا پڑے گا؟''۔

تب سے لے کر اب تک عرفان صاحب اکثر چیزیں ہمارے گھر سے ہی ادھار لے کر استعمال کرتے ہیں اور کئی بار تو ان اشیاء کو اپنی ملکیت بھی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ایک مرتبہ موصوف ہمارے ہاں سے استری لے کر گئے تو واپس کرنا بھول گئے۔ چند دن بعد ان کے گھر خود جا کر استری واپس لایا تو اگلے ہی دن عرفان صاحب ہمارے گھر پہنچ گئے۔ دروازہ کھلتے ہی فوری طور پر بولے: کل آپ ''ہماری'' استری لے گئے تھے، وہ تو واپس کر دیجئے۔ بڑی مشکل سے ان کو بتانے میں کامیاب ہوا کہ جناب وہ استری آپ کی نہیں، ہماری تھی۔ چند دن اپنے پاس رکھنے سے آپ کو اس سے اتنی انسیت ہوگئی کہ اس کے اندر ''اپنا پن'' محسوس ہونے لگا۔

چند دن ہی گزرے ہوں گے کہ عرفان صاحب کو پھر استری کی ضرورت پڑ گئی۔ پچھلے واقعے کی بری یاد بھی ذہن پر نقش تھی اور پڑوسی کے حقوق کا بھی خیال تھا۔ میں نے کہا: ''عرفان صاحب! پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اپنے استری کرنے والے کپڑے اٹھا کر ہمارے گھر لے آئیں اور یہاں پر ہی استری کر لیں''۔ اگرچہ بجلی کی بچت کا خیال آتے ہی ان کے چہرے پر خوشی کے آثار بھی نمودار ہوئے، مگر پھر بھی غصہ دکھاتے ہوئے چلے گئے اور چند منٹ بعد اپنے کپڑوں کے ہمراہ واپس آئے اور کپڑے ہمارے گھر میں ہی استری کرنے کے بعد واپس چلے گئے۔

حالات کی ستم ظریفی کہ دو دن بعد خوب آندھی آئی۔ آندھی کے بعد ہمارے گھر بے تحاشا مٹی اور کوڑا اکٹھا ہو گیا۔ صفائی کے لئے جھاڑو تلاش کرنا شروع کیا تو لاکھ کوششوں کے بعد بھی نہ مل سکا۔ یوں پہلی مرتبہ مجھے بھی عرفان صاحب کی مدد کی ضرورت پڑ گئی۔ ان کے گھر جا کر جھاڑو مانگی تو عرفان صاحب بولے:۔ ''حماد بھائی! پریشان کیوں ہوتے ہیں، جھاڑو دینا ہے تو یہاں ہمارے گھر ہی آ کر دے لیں''۔

کئی مرتبہ استری کرتے ہوئے کپڑے جل بھی جاتے ہیں۔

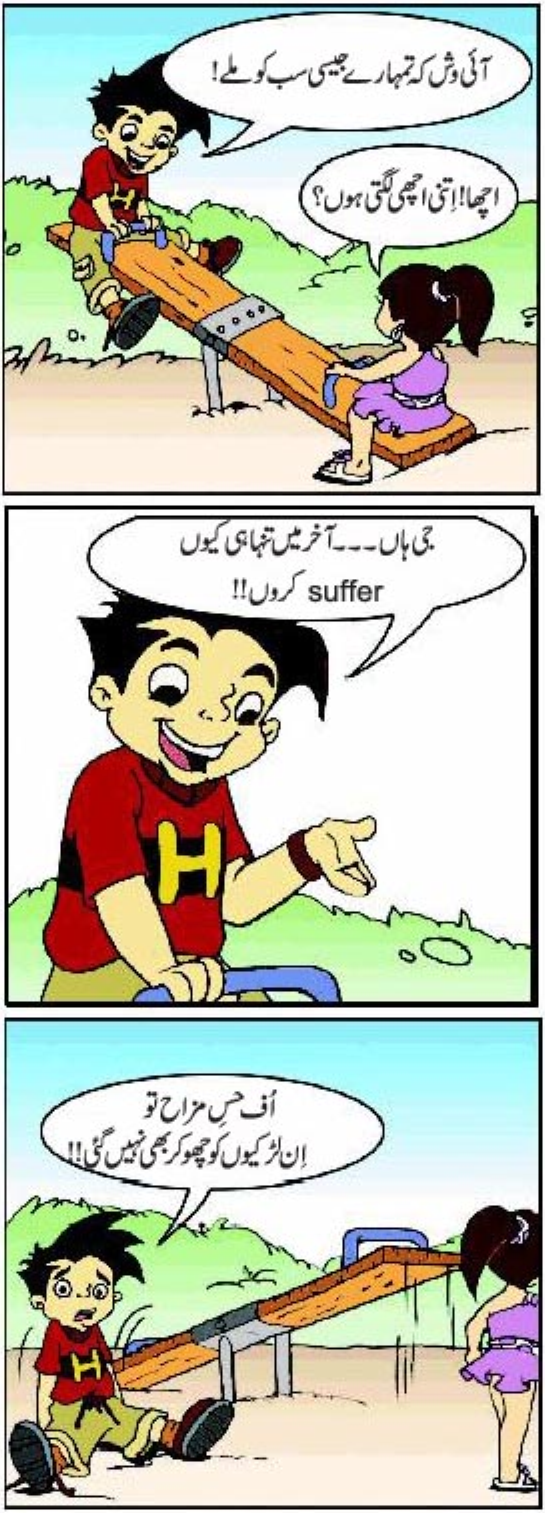

ایک بیوی نے اپنے شوہر کو مطلع کیا کہ ''آپ کی نیلی شرٹ استری کرتے ہوئے جل گئی ہے''۔

شوہر نے اپنے چہرے پر افسردگی کے معمولی سے تاثرات بھی نہیں آنے دیئے اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے بولا:۔''کوئی بات نہیں بیگم، پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ میرے پاس اس رنگ کی ایک اور شرٹ بھی موجود ہے''۔

بیوی کہنے لگی: ''بالکل یہی بات میں بھی آپ کو کہنے لگی تھی کہ پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ دراصل میں نے اس دوسری نیلی شرٹ سے کپڑا کاٹ کر جلی ہوئی شرٹ پر پیوند بھی لگا دیا ہے''۔

استری کا ٹیبل کمپیوٹر کے ماؤس پیڈ کی طرح ہوتا ہے اور استری بذاتِ خود ماؤس کی طرح ہوتی ہے۔ جتنا استری کے ماؤس کو رائٹ کلک کرتے جائیں، وہ گرم ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر آپ کی استری کپڑے جلاتی ہو تو اس کا آسان ترین حل یہی ہے کہ استری کو مکمل طور پر ''لیفٹ کلک'' کیے رکھیں اور گرم کیے بغیر ہی کپڑوں پر پھیریں۔ گارنٹی ہے کہ اس طرح کرنے سے کپڑے بالکل بھی نہیں جلیں گے۔

استری کے کئی ضمنی فوائد بھی ہوتے ہیں۔ اگر آپ کے گھر شیشہ دستیاب نہ ہو تو استری کو الٹا کر کے اس کے اندر اپنا چہرہ بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح صرف تیس منٹ کی استری کرنے سے تقریباً جسم کے اسی حرارے (کیلوریز) جل جاتے ہیں۔ بس اس دوران یہ احتیاط اہم ہوتی ہے کہ کہیں حرارے جلاتے جلاتے استری کی حرارت سے جسم کی جلد ہی نہ جل جائے۔

استری کے منفی پہلوؤں کو بھی ہرگز نہیں بھولنا چاہئے۔ منفی پہلوؤں میں پہلے پیسے خرچ کر کے استری کی خریداری، ماحول پر استری کی گرمائش کے برے اثرات، بجلی کا ضیاع اور بجلی کے بل کی ادائیگی کی صورت میں پیسوں کا ضیاع قابلِ ذکر ہیں۔ ان منفی پہلوؤں سے بچنے کا مناسب حل یہ ہے کہ اپنے کپڑے گھر میں استری کرنے کی بجائے کسی دھوبی سے استری کروا لئے جائیں۔

ہمارے محلے میں ایک چاچا رحمت نام کا دھوبی مشہور ہے۔ چاچا رحمت کے پاس ایک آدمی آیا اور بولا کہ: ''چاچا جی! پتلون استری کرنے کے کتنے پیسے لوگے؟''۔ چاچا بولے کہ: ''بیٹا صرف تیس روپے''۔ کہنے لگا:۔ ''چاچا جی! یہ لیں پندرہ روپے اور صرف ایک ہی پہنچا استری کر دیں۔ میں سائیڈ پوز میں تصویر کھنچوا لوں گا''۔

چاچا جی بہت خدا ترس آدمی تھے۔ پندرہ روپے میں ایک پہنچا استری کر دیا۔ چند دن بعد دوبارہ وہی لڑکا اسی پتلون کے ہمراہ دوبارہ استری کروانے کے لئے آیا اور پوچھا ''چاچا جی! استری کے کتنے پیسے لیں گے؟''۔ چاچا جی نے سوچا کہ پچھلی بار تیس روپے مانگے تھے تو اس نے آدھے کر کے پندرہ کروا لئے تھے۔ اب اگر ساٹھ بتاؤں تو آدھے کر کے خود بخود بھی تیس پر آ ہی جائے گا۔ جیسے ہی انہوں نے کہا کہا: ''بیٹا! استری کے ساٹھ روپے لوں گا''۔ اس اللہ کے بندے نے انتہائی فرماں برداری سے ایڈوانس ہی میز پر ساٹھ روپے رکھے اور استری اٹھا کر دکان سے باہر دوڑ لگا دی۔

استری کے دوران سب سے زیادہ نقصان کا خطرہ تب پیدا ہوتا ہے کہ جب کئی مرتبہ کپڑے استرے کرتے کرتے موبائل کی گھنٹی بجے تو تیزی میں کچھ لوگ استری کو ہی موبائل سمجھ کر کانوں سے لگا لیتے ہیں۔ بقول سید سلیمان گیلانی:۔

کر رہا تھا استری کپڑوں پہ میں
بھول ہو جاتی ہے ہر انسان سے
فون کی بیل پر اچانک چونک کر
استری میں نے لگا لی کان سے

کوئی کالم یا تحریر لکھنا بھی استری کرنے سے زیادہ مختلف نہیں ہوتا۔ آپ کو پہلے چند لائنیں لکھتے ہوئے آگے جانا پڑتا ہے اور پھر واپس شروع میں آکر نئے سرے سے تمام تحریر کی رہی سہی شکنیں (غلطیاں) اور بل (کمیاں، کوتاہیاں) ختم کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جانا ہوتا ہے۔

خرم بٹ

بٹ سے بٹ تک

صاف رنگ گول چہرہ، ادھ کھلی مخمور آنکھیں جن میں نیند کا خمار ہمہ وقت ڈیرے ڈالے رکھتا ہے۔
قدرتی لال ڈورے آنکھوں پر اپنا ایسا جال بچھائے ہیں جیسے انڈوں پر کمال مہارت سے خوبصورت نقش ونگاری کی گئی ہوں۔
گہری سوچوں کے باعث سر کے بیشتر بال اس انداز میں جھڑے ہوئے کہ ماتھے پر انگلش کا حرف ایم لکھا گیا ہے لیکن ان کو یقینی طور پر یہ خوشی بھی میسر ہے کہ ان کا سر فارغ البال یعنی گنجوں کی فہرست میں نہیں آتا۔ بھرے بھرے ہونٹ جن پر مسکراہٹ دیکھنے کو ہر وقت مفت ملتی ہے اور گمان ہوتا ہے کہ شاید سوتے میں بھی مسکراتے ہی ہوں گے۔ ٹھوڑی سے نیچے کا ابھار خوش خوراکی کو ظاہر کرتا ہے اور شخصیت کے رعب ودبدبے میں اضافہ کر رہا ہے۔
درمانہ قد، موٹاپے کی جانب مائل خوراک زدہ جسم قدرے نکلتی ہوئی توند جسے وہ اہل پیٹ افراد کی طرح اس لئے سانس کھینچ کر برابر کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ پینٹ کے اپنی جگہ سے کھسکنے کے خطرات لاحق ہو جاتے ہیں۔ بھاری بھرکم مسکراتی ہوئی بارعب شخصیت جس کے بھاری بھرکم ہونے کا احساس صحافت کے پیشے سے منسلک مجھ جیسے عام شخص سے لے کر ملک کے وزیر اعظم سمیت مختلف طبقہ ہائے فکر کے لوگوں کو بھی ہے۔ بظاہر ڈھیلے ڈھالے سے لیکن دراصل انتہائی انتھک محنتی اور بامقصد جدوجہد کے عادی۔
جی ہاں یہ افضل بٹ صاحب ہیں۔ صدر پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹ۔
بچوں کی روزی روٹی کمانے کے لئے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں میں بہت زیادہ منہمک رہنے کے باوجود کچھ کر گزرنے کا جنوں مجھے پریس کلب اور یو جے کی سیاست سے کسی حد تک جوڑے رکھتا ہے اور میں کچھ نہ کچھ وقت ضرور اس کے لئے نکال لیتا ہوں، اسی وجہ سے مجھے افضل بٹ صاحب کے قریب رہ کر کام کرنے کا موقع ملتا رہا اور وہ میرے زیرِ مشاہدہ رہتے ہیں۔
ساتھیوں کی بڑی سے بڑی تنقید کو اپنے لئے بہتر جان کر کمال ضبط سے پی جانا، کینہ نہ رکھنا اور غیبت نہ کرنے کی خوبی اور زبردست ذہنی صلاحیتوں نے آج انہیں اس مقام بلندی اور ذمہ داری پر پہنچا دیا ہے۔ سالہا سال سے یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میڈیا پر پابندیوں کا معاملہ ہو یا کوئی بھی اور معاملہ، بٹ صاحب ہراول دستے میں ہی نظر آتے ہیں۔ کبھی سینہ سپر ہو کر ساتھیوں کے ہمراہ شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کئی کئی ماہ سڑکوں پر احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی سنجیدہ مفکر کی طرح بیٹھے بٹھائے اِس طرح بڑے بڑے مسائل کا حل چٹکی بجاتے میں نکال لیتے ہیں کہ بے اختیار میرا ہاتھ اپنے سر پر کھجلی کرنے لگتا ہے۔
انگریزی کے ایک محاورہ کا ترجمہ ہے کہ مقام بلندی پر پھسلن کے لئے جابجا کیچڑ ہوتا ہے جس کے باعث مقام بلندی اور نظروں سے گرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن بٹ صاحب اپنی نادیدہ صلاحیتوں کے باعث جس طرح ہمیشہ

بلندی پر ٹکے رہتے ہیں یہ بھی اُنہی کا خاصا ہے کہ وہ کس طرح دوستوں کو خود سے منتھی رکھتے ہیں۔ میں نے ہر وقت اُن کے گرد افراد کا ہالہ دیکھا ہے۔ وہ اپنے چاہنے والوں میں گھرے رہتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اُن سے قربت رکھنے والا ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کے زیادہ قریب ہیں۔ ہر کسی کی بات انتہائی غور سے سنتے ہیں، جس سے ہر بیان کرنے والے کی انا کو تسکین پہنچتی ہے۔ خود انتہائی مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ مذہبی، سماجی تقریبات ہوں یا میوزیکل پروگرام ہر محفل سے انصاف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کی شخصیت کسی سیال شے کی مانند ہے جو ہر ماحول میں خود کو ڈھال لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

بٹ صاحب چونکہ نسلاً بٹ ہیں اس لئے اُن کا خوش خوراک ہونا اچنبھے کی بات نہیں۔ ماشااللہ دستر خوان پر کھانے پینے کی ہر چیز ختم ہو جانے تک بیٹھے رہتے ہیں اور اکثر دوبارہ منگوانے سے بھی نہیں چوکتے۔ میں اُنہیں اکثر چھیڑتا ہوں کہ میں ایک مہینے میں اتنا زیادہ کھانے والا اتنا ذہین شخص میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا، جس پر وہ مسکراتے ہوئے کھانے کی رفتار اور تیز کر لیتے ہیں۔۔۔۔

بٹ صاحب کی زندگی کا حیرت انگیز پہلو کھیل سے رغبت ہے۔ اُن کا ڈیل ڈول دیکھ کر کوئی نیا فرد اندازہ نہیں لگا سکتا کہ بٹ صاحب صحافیوں کے مابین کھیلوں کے مقابلوں میں کس جذبے سے اپنا حصہ ڈالتے ہیں، یہ الگ بات کہ کرکٹ کھیلتے وقت اُن کے رنز لینے کی دوڑ سے پچ پر جو کھڈے پڑتے ہیں وہ مسلسل تین دن رولر پھیرنے سے بھی برابر نہیں ہوتے۔ بٹ صاحب کو اپنی جانب بے ہنگم بھاگتے دیکھ کر ہر ذی روح کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ آگے سے ہٹ جائے ورنہ زد میں آنے والے کا جو حال ہوگا اُس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔ کئی من گوشت کو اپنی مضبوط ہڈیوں پر لپٹائے بھاگتے وقت بٹ صاحب اچانک بریک نہیں لگا سکتے جس پر گینڈے کا خیال ہے کہ وہ اُس کی نقل کرتے ہیں۔

بٹ صاحب اکثر میرے لمبے قد کے باوجود ان سے آدھے وزن، اور کم خوراکی پر چھیڑنے کی غرض سے میرے بٹ ہونے پر شک کا اظہار کیا کرتے ہیں، جس پر میں برجستہ ازراہِ مذاق جھوٹ موٹ کہتا ہوں کہ میں پڑھا لکھا بٹ ہوں، مجھے پتا ہے کہ کتنی خوراک لینی ہے اور اپنے سانولے پن پر میرا جواب یہ ہوتا کہ ابھی آپ نے افریقہ کے بٹ نہیں دیکھے جس پر وہ ہنسنے لگتے ہیں اور ساکت بیٹھے ہونے کے باوجود اُن کا پیٹ محوِ رقص ہو جاتا ہے۔

بٹ صاحب کی کاوشوں کے باعث آٹھویں ویج ایوارڈ کی تشکیل کے کام میں بھی پیش رفت ہوئی ہے۔ خدا بٹ صاحب اور اُن کی ٹیم کی صحافیوں کی فلاح و بہبود کے ہر کام کا حامی و ناصر ہو اور بٹ صاحب کا سایہ اُن کے خاندان اور صحافتی برادری کے لئے انکی خدمت کے جذبے کو قائم رکھے۔۔ آمین۔

بہانہ

(قطعہ با تصویر)

مجھے سچ سچ بتاؤ کہ میں موٹی لگ رہی ہوں کیا
(یہ ہاں کہہ دے تو پھر پکا ارادہ ہے چڑھائی کا)
مجھے پہلے بتاؤ کہ میں گھامڑ لگ رہا ہوں کیا
(کہ میں سچ سچ بتا کر تم کو موقع دوں لڑائی کا)

نوید ظفر کیانی

کائنات بشیر، جرمنی

گھر آیا مہمان

گھر آیا مہمان کوئی جان نہ پہچان،
پھر اس کی پہچان بہت جلد بن جاتی۔۔!

جب تک یہ کسی گھر نہیں پہنچتا تھا اس کی حیثیت ایک۔۔ مسافر۔۔ کی سی رہتی۔ جو راستوں کی خاک چھانتا ہے، گرد و غبار، مٹی پھانکتا ہے۔ بالوں میں کنگھی گھسنے کی روادار نہیں رہتی اور وہ سر جھاڑ منہ پھاڑ میزبان کے سامنے حاضر ہوتا لیکن مطلوبہ گھر میں داخل ہوتے ہی مہمان کے رتبے پر فائز ہو جاتا۔ ساتھ ہی اسے وی آئی پی حیثیت حاصل ہو جاتی۔ کہہ دینے میں کیا حرج ہے کہ کرائے کی سواری سے اترتے ہی مہمان کو فائیو سٹار ہوٹل جیسی سہولیات میسر ہو جاتیں۔ گھر والوں کو اس کے لیے بیرا، باورچی، ملازم اور باادب خوش اخلاق میزبان بننا پڑتا۔۔ گھر نہ معلوم مدت کے لیے مہمان سرا بن جاتا۔۔!

جب زمانہ دھیمی چال چلتا تھا تب مہمان کا خوب بول بالا تھا۔ مہمان کے حقوق بھی پڑوسی سے کم نہ تھے۔ اللہ کی بھیجی ہوئی رحمت جس کے آنے سے در پردہ گھر والوں کا رزق بڑھ جانا تھا۔ سو سب اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس کی خدمت کرتے۔ اس تالا بند، راز سے مہمان بھی بخوبی واقف ہوتا اور وہ ان کے لیے رزق کی کنجی بن کر دھڑلے سے جتنا چاہتا، قیام کرتا۔ بے تکلفی سے میزبان کا جوتا پاؤں میں ڈال لیتا۔ اسی کا تولیہ، صابن، کنگھی، ٹوتھ پیسٹ، حتٰی کہ میزبان کا نائٹ ڈریس بھی بلا تکلف اتنے دنوں اُسی کا ہو جاتا۔ وہ ان کا اتنا عادی ہو جاتا کہ کبھی کبھی تو وہ چیزیں گمنام بن کر اس کے سامان میں بھی چلی جاتیں۔ اِدھر اہل خانہ کو تیوری چڑھائے، ماتھے پر شکن لائے بغیر اس کی خدمت کرنی پڑتی۔ اسکی کسی ناپسندیدہ عادت کو کھلے دل سے نظر انداز کر دیا جاتا۔ گھر کے بچوں پر علیحدہ مارشل لاء لگ جاتا اور وہ شرارتوں سے نابلد بچے بچے بننے کی اداکاری کرتے۔۔

مروت کے مارے لوگ مہمانی چولا پہن کر بغیر اطلاع کے سرپرائز دے دیتے۔۔ اکثر تو پورا کنبہ ہی اچانک چھاپہ مار لیتا اور دور دراز کے میزبان پر اچانک کے امتحانی پرچے کی طرح نازل ہو جاتا۔ گھر والے بچارے بغیر تیاری کے اس امتحان میں بیٹھ جاتے۔ اور وہ گھر تو گھر باہر نکل کر محلے میں بھی اکڑ اکڑ کر چلتے۔ سب کے لیے باعث تجسس ہوتا کہ یہ سواریاں آخر کس گھر اتری ہیں۔۔؟

اگر دن بھر مسافت میں رہا یہ مسافر آدھی رات کو آ جاتا تو بھی پورے استحقاق سے دروازے کی گھنٹی پہ گھنٹی بجائے جاتا۔۔ چاہے پورا محلہ جاگ جائے اس کی خطا معاف۔۔ میزبان آنکھوں میں نیند کے ڈورے لیے، کسلمندی سے جب دروازہ کھولتا تو مہمان ایک غصے، شکایت بھری گھوری اُس پہ ڈالتا۔ جس کا مطلب ہوتا،

دروازہ جلد کیوں نہیں کھولا؟

کیا نشہ کر کے سوئے تھے۔۔؟

یا گدھے گھوڑے بیچ کر سوئے تھے؟

یہ دیکھ کر میزبان کو سستی چھوڑ کر چستی لانا پڑتی۔ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجانی پڑتی۔ نیم وا آنکھیں پوری کھولنی پڑتیں ورنہ مہمان کیا کہے گا کہ اس کا ٹھیک سے استقبال نہیں کیا۔ آخر کل

کلاں کو خاندان میں وہ اس بات کی ایک کی چار لگا سکتا ہے۔ یوں ناک کٹ سکتی ہے۔

مہمان کے آنے سے گھر میں رحمت کا نزول ہوتا جسے پانے کے لیے گھر والوں کو بڑی محنت کرنی پڑتی۔ دن ہوتا تو سب سے پہلے بچے کو بھیج کر اسکے لیے ٹھنڈی ٹھار بوتل منگائی جاتی۔ اسے گھر کی سب سے اعلیٰ ترین چپل ایسے پیش کی جاتی جیسے وہ اب تک ننگے پاؤں چل کر آیا ہے یا خدانخواستہ اس کا زادِراہ کہیں لُٹ پُٹ گیا ہے۔۔ پھر اسے خاص طور پر نیا سفید تولیہ دیا جاتا (وِنی، پرانے تولیہ دینے سے گھر کا سٹینڈرڈ نیچے آسکنے کا ڈر تھا، نی) نئی صابن کی ٹکیہ اس کے ہاتھ میں تھمائی جاتی اور مؤدب ہو کر غسل خانے تک رہنمائی کی جاتی۔ اگر مہمان گاؤں کے ہوتے تو ان کے لیے علیحدہ حقے پانی کا انتظام کرنا پڑتا۔۔ (نہ جانے وہ سگریٹ پی کر گزارا کیوں نہیں کر لیتے تھے؟ چار آٹھ دن حقے سے دور کیوں نہیں رہ پاتے تھے) تب گھر کا کوئی فرد حقے کو اچھی طرح نہلاتا نظر آتا اور اس کی چلم ٹوپی کے لیے لکڑیوں میں پھونکیں مارتا، آگ سلگاتا، آنکھیں لال کرتا دکھائی پڑتا۔ افسوس، سوئی گیس یہ ضرورت پورا نہیں کرتی تھی۔ زمانے نے کروٹ ضرور بدلی۔۔ بیڑی سے سگریٹ، سگریٹ سے سگار اور پائپ آگئے، پر صد افسوس، گیس والے حقے نہ آئے۔۔ سو تب لوگ یونہی وارد ہو کر ویلے لوگوں کو ایسے کام پہ لگا دیا کرتے تھے۔

مہمان کو اچھے سے اچھا کھلایا جاتا۔ گھر کا اعلیٰ سے اعلیٰ کمرہ اور نواں نکور بستر اُسے دیا جاتا۔۔ سفید براق چادر، خوبصورت پیرہن کی نرم گرم رضائی اور کوئی شعر لکھا تکیہ۔۔!

یاالٰہی! نرم تکیہ باعثِ صحت رہے
سونے والا سو رہا ہے جاگتی قسمت رہے

مہمان اپنی قسمت پہ نازاں شعر پڑھ کر تکیے پہ اپنا سر ڈال دیتا۔۔ شعر اچھا لگا کہ نہیں، اس کا فیصلہ بھی تکیے پر سر رکھتے ہوئے ہو جاتا۔۔ جبکہ میزبان کا بس نہ چلتا کہ مہمانی خاطر داری میں اُسے لوری گا کر سلا دیں۔۔

بچارے گھر والے کسی ہنگامی حالت کی طرح ایک چارپائی پر دو تین لوگ سمٹ سمٹا کر پڑ رہتے۔۔ پوری رات لاتوں کا میچ چلتا۔ پسلیوں میں کہنیاں بجتیں۔۔۔ ایک کمبل کی کھینچاتانی میں دھما چوکڑی مچتی۔ لیکن مہمان کو اس سے کوئی سروکار، غرض نہ ہوتی۔۔ یہ میچ جتنے دن مرضی کھیلا جائے اس کی بلا سے۔۔ ناولوں، افسانوں کی طرح مہمان کے لیے تنگ ہو کر مرغی، حلوے مانڈے کا انتظام کیا جاتا اور باقی اہل خانہ دال، شوربے میں روٹی ڈبو کر کھا لیتے۔۔ روایتی میٹھی سویٹ ڈش بھی صرف مہمان کے حصے میں آتی۔ نہ جانے مہمان کو۔۔ دعوتِ شیراز۔۔۔ کیوں نہیں کھلائی جاتی تھی۔۔؟

ہمیں اپنے بچپن کے وہ مہمان یاد آتے جو دور دراز علاقوں سے آیا کرتے تھے۔ اول، آخر تو کیا یقیناً وہ بغیر اطلاع کے آتے تھے، پھر جو بستر پر براجمان ہوتے تو ہلنے کا نام تک نہ لیتے۔ حتیٰ کہ کھانے کا وقت ہو جاتا۔ کھانا تیار ہونے کی نوید مل جاتی۔ پر اس خوشگوار خبر پر بھی وہ جوں کے توں بستر پر بیٹھے اور لیٹے رہتے۔ تب چار و ناچار کبھی بھائی کو اور کبھی مجھے اپنے کندھے پر ایک تولیہ ڈال کر، ایک سٹین لیس سٹیل کا لوٹا نیم گرم پانی سے بھر کر اور ایک خالی برتن لے کر اُن بستر پر بیٹھے ست اونگھتے ہوئے مہمانوں کے ہاتھ باری باری دھلوانا پڑتے اور انھیں وہ تولیہ پیش کرنا پڑتا۔ ہم یہ کام والدین کے کہنے پر خاموشی سے کر دیتے لیکن ہمارے ذہن میں یہ سوال ضرور شور مچا رہے ہوتے کہ جو مہمان اتنی دور سے اتنے گھنٹے سفر میں گزار کر چل کر آئے ہیں تو اب ان کے ساتھ ایسی کیا مجبوری ہو گئی ہے کہ وہ دو چار قدم مزید چل کر غسل خانے تک نہیں جا سکتے؟ یہ سوال اس وقت تک ہمارے ذہنوں میں کھلبلی مچاتے رہے جب تک ہم یونہی چارپائی پر بیٹھے مہمانوں کے ہاتھ دھلاتے رہے۔۔۔

زمانے کی تیزی گزرتے وقت نے اس کا بھی جواب دے دیا۔ بھئی مہمانوں کا ایسے ہی خیال رکھا جاتا تھا۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ چلو کچھ عرصہ ہم بھی لکھنو والوں کی طرح اپنے روپے دوسروں پر نثار کرتے رہے۔۔ انجانے میں نیکیاں سمیٹتے رہے۔

ویسے مستنصر حسین تارڑ کے کئی سفرناموں میں شدید تھکاوٹ

ہونے پر ان کے بلتی پورٹران کی خوب مُٹھی چاپی کرتے تھے۔ بقول انکے ان علاقوں میں وہ لوگ آج بھی اپنے گھر آئے ہوئے مہمانوں کو یونہی عزت دیتے ہیں۔ پہلے اُنھیں دباتے ہیں، ان کی تھکاوٹ دور کرتے ہیں اور پھر اُنھیں کھانا پیش کرتے ہیں۔ یہ پڑھ کر اس دل کی بیقراری کو قرار آیا۔۔ بچ گئے۔۔ کیا ہوا ہمیں تو صرف مہمانوں کے ہاتھ ہی دھلوانے پڑتے تھے۔ مہمانوں کی مُٹھی چاپی تو نہیں کرنی پڑتی تھی ورنہ ہم مالشیے بھی بن جاتے۔

پورا سال ہم بڑے سلیقے سے لاہوری بن کر زندگی گزارتے۔ گرمی کی تعطیلات میں مہمان یوں اترتے گویا پکنک سپاٹ کھل گیا ہے۔ تیتر، بٹیر کی طرح مہمان اور میزبان گھل مل جاتے۔ اکثر ہمارے اور مہمانوں کے کپڑے آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے۔ کھانے پہ کھانے پکتے۔ وہ بستر جو پہلے چھپ چھپا کے کسی کونے کھدرے یا الماریوں میں سمٹے رہتے۔ اب سرعام اپنی نمائش کرتے نظر آتے۔ قہوہ خانے کی طرح چائے چلتی۔ ناشتہ، لنچ اور ڈنر، لگتا زندگی اس مدار کے گرد گھومنے لگی ہے۔ نخرے کی طرح ناشتہ ختم ہوتا تو فکر کی طرح دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی۔ شام کی چائے کا کپ ہاتھوں میں ہوتا تو رات کے کھانے کی سوچ بیچار ہونے لگتی۔ رات کا کھانا ختم ہوتا تو لگتا گھر میں جوڑی دار بستر گھومنے لگے ہیں۔۔ اچھے مہمان ہوتے تو تھوڑی گھر والوں کو مدد کی پیشکش کر دیتے۔ چارپائی پہ چادر بچھتے دیکھ کر آگے بڑھ کر دو کونے وہ بھی پکڑ لیتے۔ ورنہ گھر سے جو اکڑا مہمانی چولا پہن کر آتے تو اسی میں لیٹے گھر والوں کی پھرتیاں ملاحظہ فرماتے اور مہمانی کے آرام و سکون پاتے۔ ورنہ انکے اور ہی خاص الخاص مشاغل ہوتے۔۔۔

اوپر جا کر چھت پر ٹہلنے لگتے اور اہل محلہ کے گھر جھانک کر ان کے کام کاج سے آگاہی حاصل کرتے۔۔۔

پتنگوں اور کبوتروں کی پرواز دیکھتے۔۔۔

صحن میں چارپائی پر موٹے موٹے تکیے کے سہارے نیم دراز پڑے رہتے اور مہمانی کے مزے لوٹتے۔

بادشاہی مسجد، شاہی قلعہ، شالامار باغ، مینار پاکستان، داتا

دربار، انارکلی، بانو بازار۔۔۔ پورا لاہور چھان مارتے۔۔۔

مغلیہ نوردات سے جتنا مہمانوں کی صنف نے فائدہ اٹھایا ہے اتنا تو لاہوریوں نے بھی نہیں اٹھایا ہوگا۔۔۔

بھئی آج کیا پکے گا؟ کا مشہور زمانہ، روز کا سوال چند دن کے لیے ان کے سروں سے ہٹ جاتا اور میزبانوں کو دہلائے رکھتا۔ مرغ پلاؤ، روسٹ، مرغ چنے، سٹیم روسٹ، ہر وقت مرغ چلتا اور بے چارے مرغ کی شامت آئی رہتی۔ اوپر سے گرمی اپنے رنگ دکھاتی۔ غسل خانہ کبھی بھی خالی اور خشک نظر نہ آتا۔ پر ان باتوں سے ماسواء مہمانوں کے ساتھ بہت سی چیزیں خوشی خوشی بانٹ لی جاتیں اور خوش رہتے کہ خدائی مہمان آئے ہیں۔۔۔

پڑوس میں کراچی سے رہنے والے لوگ سکونت پذیر تھے۔ ان کے گھر جب بھی مہمان آتے تو وہ اپنا بوریا بستر ساتھ لاتے۔ جتنے لوگ اتنے بستر بند۔ تو یہ بات کچھ اچنبھے کا باعث بنتی، کہ باقی سب چیزیں تو میزبان کی استعمال کی جاتی ہیں پھر یہ بستر اپنا اپنا والی بات کچھ پلے نہ پڑتی۔ سوچتے اگر ایسی رواداری کی بات تھی تو حضرت اتنے دنوں کا کھانا بھی پکا کر ساتھ لے آتے۔ کبھی خیال آتا شائد،

انھیں دوسرے کے بستر میں سونا پسند نہیں ؟

یا انھیں اپنے تکیے بستر کے علاوہ نیند نہیں آتی؟

یا خدانخواستہ انھیں میزبان کی صفائی ستھرائی پہ چنداں اعتبار نہیں؟

اسی لیے یہ تام جھام اٹھا کر اپنا کام بڑھائے رہتے ہیں۔ ٹرین کے سفر میں کراچی سے پشاور اور پشاور سے کراچی جانے والے مسافر اسی طرح ڈھیر سارے بستر بند، لوٹے، اگالدان، پاندان اضافی سامان کے ساتھ نظر آتے رہے تو عقدہ کھل گیا کہ یہ ان لوگوں کے ہاں۔۔۔ رواج۔۔۔ ہے اس طرح کی چیزیں لانے جانے کے لیے۔۔۔

واللہ، کیا رواج ہے۔۔۔

جس کا ایک مثبت پہلو آشکارا ہو گیا کہ جس طرح ایک میزبان کو اچھے سے اپنی میزبانی نبھانی ہے عین اسی طرح مہمان کو بھی اچھی مہمانی کا مظاہرہ کرنا ہے اور اپنے میزبان کو بے جا تکلفات اور زحمت سے بچانا ہے۔ تو یقیناً یہی بات بستر اپنا اپنا کے رویے میں ہوتی ہوگی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بعض دفعہ اچھی بات بھی معاشرے کے چلن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لیے فلم انداز اپنا اپنا تو بن گئی لیکن بستر اپنا اپنا رواج تشکیل نہ پا سکا۔۔۔ اب وقت بدل گیا ہے۔۔۔ رشتہ ابھی وہی ہے لیکن اس میں جدت کے رنگ شامل ہوگئے ہیں۔

مہمان بھی اپنا سامان پورا لے کر آتا ہے۔ اب اسے بھی اس بارے فکر ہونے لگی ہے کہ میزبان کی چیزیں استعمال کرنے پر میزبان اس کے بارے میں کیا سوچے گا؟

کنجوس، غیر مہذب، اجڈ، گنوار کہیں کا۔۔۔!

خاتون خانہ کو بھی مہمانی خاطر داری کے لیے ہر وقت کچن میں نہیں گھسنا پڑتا۔۔۔ ورنہ پہلے وہ بھی مہمان کی خاطر داری میں سر جھاڑ منہ پھاڑ پورا وقت باورچی خانے میں نواع و اقسام کے کھانے بناتے نظر آیا کرتی تھی۔ سو تکلف چھوڑ دیا گیا ہے اور ضرورت پر کاروبار جما ہے۔ ناشتے، برنچ کا کاروبار صبح صبح حلوہ پوری، نان چنے، سری پائے، روغنی نان اور انواع و اقسام کے کھانوں سے چکانے والوں نے سنبھال لیا ہے۔ فراخدل میزبان اب مہمانوں کی خاطر داری فوڈ سٹریٹ اور مختلف انواع کے ریسٹورنٹ میں کرنے لگے ہیں۔ وقت نیا یک ایک لمحہ قیمتی بنا دیا ہے۔ اب نہ تو کسی کے پاس آئے دن جا کر دنوں مہمان بننے کا وقت رہا ہے نہ ہی میزبان کے پاس اضافی وقت ہے۔ اب تو یہ رشتہ ڈاکٹر کی اپائمنٹ کی طرح بھگتایا جانے لگا ہے۔۔۔

المختصر۔۔۔

یہ رشتہ ترقی پذیر ہوا یا روایات کہیں کھو گئیں۔ علیحدہ مدعا لیکن بھائی اور مجھے ہمیشہ یہ گلہ باقی رہے گا کہ جن مہمانوں کے ہم ہاتھ دھلایا کرتے تھے، تو جب ہم ان کے ہاں مہمان بنا کرتے تھے تو وہ عین اسی طرح ہمیں بستر پر بٹھا کر ہمارے ہاتھ کیوں نہیں دھلواتے تھے؟

گلِ نوخیز اختر

خواتین کی ڈرائیونگ

ایک عورت نے اپنے شوہر کو آفس فون کیا اور پوچھا کہ آپ مصروف تو نہیں' شوہر نے دانت پیس کر کہا ''میں اس وقت میٹنگ میں ہوں کیوں فون کیا ہے؟'' جواب آیا ''آپ کو ایک اچھی اور ایک بُری خبر سنانی تھی''۔ شوہر گرجا ''خبردار اگر کوئی بری خبر سنائی' جلدی بتاؤ اچھی خبر کیا ہے؟؟؟'' بیوی چہک کر بولی ''وہ جو ہم نے نئی گاڑی لی تھی ناں' اُس کے ائیر بیگز بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں''۔

اگر آپ کسی تنگ پارکنگ میں کھڑے ہوں اور اچانک کوئی گاڑی نمودار ہو کر چھوٹی سی جگہ میں بھی کسی گاڑی کو نقصان پہنچائے بغیر بہترین طریقے سے پارک ہو جائے تو فوراً یقین کر لیجئے گا کہ اِسے کوئی مرد چلا رہا ہے۔ لیکن اگر گاڑی دو تین دفعہ آگے پیچھے ہو کر پارکنگ میں جگہ بنائے تو پھر بھی یقیناً اسے کوئی مرد ہی چلا رہا ہوگا...... تاہم اگر آنے والی گاڑی آپ کی گاڑی کے پیچھے پارک ہو جائے تو الحمدللہ پھر بھی اسے کوئی مرد ہی چلا رہا ہوگا۔ خاتون کا شائبہ تو اُس وقت ہونا چاہیے جب پارکنگ کی ڈھیر ساری جگہ ہو لیکن آنے والی گاڑی سیدھی آپ کی گاڑی میں جا گھسے۔ خواتین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جب وہ گاڑی چلا رہی ہوں تو ساری ٹریفک وفات پا جائے' یہ ون وے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غلط رخ پر بھی گاڑی چلا رہی ہوں تو سامنے سے آنے والوں کو کوسنے دیے جاتی ہیں کہ کم بخت سب کے سب غلط آ رہے ہیں۔ مرد کو جب تک گاڑی ریورس نہ کرنی آ جائے وہ سمجھتا ہے کہ اسے ابھی گاڑی نہیں چلانی آتی' لیکن خواتین صرف دروازہ کھولنا ہی سیکھ جائیں تو انہیں کامل یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ ڈرائیونگ سیکھ گئی ہیں۔ جن خواتین کو ڈرائیونگ نہیں آتی وہ بھی چلتی گاڑی میں حتی المقدور اپنا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات تو شوہر گاڑی ریورس کر رہا ہو تو ساتھ بیٹھی بیگم اچانک بیک مرر کا رخ اپنی طرف کر کے لپ اسٹک ٹھیک کرنے لگ جاتی ہے اور چیخ تب مارتی ہے جب آدھی گاڑی گندے نالے میں جا گرتی ہے۔ کئی خواتین تو گھر سے گاڑی لے کے نکلیں تو گھر والے باقی شہر کی سلامتی کی دعا کرنے لگتے ہیں۔ شادی شدہ خواتین کی ڈرائیونگ سب سے خطرناک ہوتی ہے' یہ ٹریفک کے اشارے پر رک بھی جائیں تو ہینڈ بریک لگانے کی بجائے بیک گیئر لگا کے اطمینان سے ببل گم چباتی رہتی ہیں' نتیجتاً اشارہ کھلتے ہی فل ریس دیتی ہیں اور پیچھے کھڑا بیچارہ سکوٹر والا رگڑا جاتا ہے' سارا قصور اِن کا اپنا ہوتا ہے لیکن اپنے پروں پہ پانی نہیں پڑنے دیتیں' الٹا غریب سکوٹر والے پر چڑھ دوڑتی ہیں ''بدتمیز' کمینے' شرم نہیں آتی خاتون کی گاڑی کے پیچھے سکوٹر لگاتے ہوئے''۔ ہماری ایک کولیگ بھی ایسے ہی گاڑی ڈرائیو کرتی تھیں اور ان کے گھر والے بڑے فخر سے بتایا کرتے تھے کہ ہماری بیٹی کئی دفعہ گاڑی صحیح سلامت بھی واپس لا چکی ہے' اس کے گھر والوں نے اس کے لیے خصوصی طور پر

ایک ڈرائیور رکھا ہوا ہے جسے گاڑی تو نہیں چلانی آتی تاہم وہ بی بی جی کے ساتھ ضرور بیٹھتا ہے تاکہ ہر وقوعے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر سکے۔ میں کئی ایسی خواتین کو جانتا ہوں جو ڈیڑھ سو میٹر کا سفر ہینڈ بریک کھینچے ہی طے کر جاتی ہیں اور واپسی پر اپنے مکینک کو فون کر کے پوچھ رہی ہوتی ہیں کہ ''ابھی تو کل ٹیوننگ کروائی تھی پھر گاڑی اتنی بھاری کیوں ہو گئی ہے؟''۔ ایسی خواتین کو ہینڈ بریک نیچے کرنا اُس وقت یاد آتا ہے جب ہینڈ بریک کھینچنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مرد اگر گاڑی کا انجن آئل چینج کرائے تو تاریخ لکھ کر پاس رکھ لیتا ہے اور ہر وقت میٹر پر نظریں جمائے رکھتا ہے کہ دو ہزار کلومیٹر سے زیادہ نہ ہونے پائے۔ اس کے برعکس گاڑی اگر خاتون کے زیرِ استعمال ہو تو انجن آئل ختم ہونے کا پتا اُس وقت چلتا ہے جب خاتون بڑے جوش و خروش سے اپنے شوہر کو بتاتی ہے کہ ''نعیم! وہ جو گاڑی کے میٹر پر ایک لائٹ کبھی نہیں جلتی تھی ناں اب وہ بھی دو تین ماہ سے بالکل ٹھیک جل رہی ہے۔'' آپ نے بہت کم کسی خاتون کو اپنی گاڑی کا انجن آئل چینج کراتے دیکھا ہوگا' وجہ صرف یہ ہے کہ ایسا جب جب ہوا' گاڑی کرین کی مدد سے نکالنی پڑی۔ خواتین کی گاڑی پنکچر ہو جائے تو یہ بھی قابلِ دید منظر ہوتا ہے' یہ سانحہ اگر سڑک کے عین بیچ میں پیش آجائے تو یہ اطمینان سے گاڑی وہیں کھڑی کر کے گھر فون کر دیتی ہیں کہ ''شہباز گاڑی پنکچر ہو گئی ہے ذرا فارغ ہو کے آجاؤ''۔ اس دوران خواہ بدترین ٹریفک جام ہو جائے یہ اطمینان سے گاڑی کے اندر بیٹھی مختلف بٹنوں کو چھیڑتی رہتی ہیں کہ شائد کوئی بٹن دبانے سے خود بخود پنکچر لگ جائے۔ گاڑی کا ٹائر بدلنا بھی خواتین پر ختم ہے' اول تو یہ خود ٹائر بدلنے کی بجائے راہ چلتے کسی بندے سے فرمائش کرتی ہیں لیکن اگر اپنے زورِ بازو پر ''جیک اور پانا'' نکال بھی لیں تو پہلے ٹائر کے نٹ ڈھیلے کرنے کی بجائے جیک لگا کر گاڑی کو اوپر اٹھاتی ہیں اور پھر ٹائر کھولنے کی کوشش کرتی ہیں' نتیجتاً اکثر ٹائر کھولنے کے دوران خود بھی گھوم جاتی ہیں۔ یہ منظر بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ خواتین ٹائر پنکچر ہونے پر ڈگی کی بجائے بونٹ کھول کر بیٹھی ہوتی ہیں۔ لڑکیاں عموماً آٹو گیئر گاڑی چلانا پسند کرتی ہیں اور پوری کوشش کرتی ہیں کہ سائڈ اور بیک مرر میں دیکھنے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔ کوئی لڑکی اگر گاڑی چلاتے ہوئے دائیں طرف کا انڈیکیٹر دے تو سمجھ جائیں کہ وہ بائیں طرف مڑنا چاہ رہی ہے۔ انہیں دن کے وقت اوورٹیک کرتے ہوئے ''ڈمر'' دینا پڑ جائے تو گاڑی کی پوری ہیڈ لائٹ آن کر لیتی ہیں' راستے میں اگر کوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند کرنے کا اشارہ کرے تو اُسے بیہودہ انسان تصور کرتے ہوئے گھور کر بڑبڑانے لگتی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدنی تھی جس کی مالکہ

غلط فہمی

ٹیکس والوں کو کہاں اِس کی خبر
کس قدر نوٹس سے ہے گھائل کوئی

رونگٹے میرے کھڑے ہیں ناصحا!
یہ نہیں بالوں کا اسٹائل کوئی

نوید ظفر کیانی

ایک خاتون تھی اور اس نے اشتہار میں لکھا تھا کہ اس کی گاڑی میں ''پاور سٹیرنگ'' ہے۔ میں نے ٹرائی لینے کے لیے گاڑی سٹارٹ کی تو سٹیرنگ کو دائیں طرف گھمانے کی کوشش میں میرا کندھا اتر گیا' میں نے بے بسی سے پوچھا کہ ''محترمہ آپ نے تو کہا تھا کہ پاور سٹیرنگ ہے ۔۔۔۔اٹھلا کر بولیں'' ہاں تو کیا سٹیرنگ گھماتے ہوئے پاور نہیں لگ رہی؟؟؟''

مرد کی گاڑی کے نیچے اگر کوئی آجائے تو وہ فوراً بریک لگا لیتا ہے جبکہ خواتین یہ سوچ کر پوری گاڑی اوپر سے گذار دیتی ہیں کہ کم بخت نیچے تو آ ہی گیا ہے اب بریک لگانے کا کیا فائدہ؟؟ ایسی خواتین کی گاڑی کی ٹینکی پٹرول سے آدھی بھری بھی ہوئی ہو تو یہ اپنی دو انگلیوں سے میٹر پر اس کا درمیانی فاصلہ ماپ کر پٹرول پمپ والے سے لڑنے لگتی ہیں کہ تین ہزار کا اتنا سا پٹرول کیوں ڈالا ہے؟ ان میں سے اکثر کے پاس لائسنس نہیں ہوتا' اور جن کے پاس ہوتا ہے ان کے پاس بھی نہیں ہوتا بلکہ گھر پڑا ہوتا ہے۔ خواتین کا کہنا ہے کہ وہ اگر گھر چلا سکتی ہیں تو گاڑی کیوں نہیں؟ صحیح کہتی ہیں' اگر انہیں گھر میں بندے کا بیڑا غرق کرنے کا حق حاصل ہے تو سڑکوں پر کیوں نہیں۔ خواتین کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ پوری توجہ سے گاڑی چلائیں اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے اِدھر اُدھر مت دیکھیں' اسی لیے ہر موڑ پر گاڑی پوری ذمہ داری سے کہیں نہ کہیں ٹھوک دیتی ہیں۔ اس کے باوجود خواتین کی ڈرائیونگ کے دو پہلو قابل تعریف ہیں۔ ایک یہ کہ مرد حضرات گرمی میں بغیر اے سی کی گاڑی چلا رہے ہوں تو ان کے ہاتھ مسلسل کچھ نہ کچھ کھجانے میں مصروف رہتے ہیں تاہم خواتین پورے تحمل سے روبوٹ بنی بیٹھی رہتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ خواتین کبھی تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کرتیں' خود ہی سوچئے پہلے گیئر میں گاڑی زیادہ سے زیادہ کتنی تیز چل سکتی ہے؟؟؟

رقیب سُرخ رُو!

محفلِ مشاعرہ پورے عروج پر تھی۔ ہر شخص بڑے انہماک اور توجہ کے ساتھ مختلف شاعروں اور شاعرات کے کلام سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ آخر میں مہمانِ خصوصی کو، جو ایک معروف و مقبول شاعرہ ہیں، دعوتِ کلام دی گئی۔ ایک دو غزل تحت اللفظ سنانے کے بعد شاعرہ نے ذرا ترنم سے اپنی آواز کا جادو جگانا شروع کیا تو ساری محفل جھوم اٹھی۔ ایسا غضب کا ترنم کبھی کبھار ہی سننے میں آتا ہے۔ آواز کے ساتھ ساتھ اُن کی آنکھوں اور ہاتھوں کے اشارے بھی رواں دواں تھے۔ ہم مارے خوشی کے دیوانے ہوئے جا رہے تھے، کیوں کہ اِن کا فرادا اشاروں کا نشانہ خاص طور پر ہم ہی تھے۔ ہمارا دماغ ساتویں آسمان پر اُڑنے لگا۔ ایسی خوب صورت اور خوش گلو شاعرہ ہم پر عاشق ہوئی جا رہی تھی۔ یہ تو مارے خوشی کے مر جانے کا مقام تھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ فکر بھی ہمیں ستانے لگی کہ یہ مہربانیاں ہم پر کیوں کی جا رہی ہیں ، جب کہ آج سے قبل نہ ہم نے انھیں دیکھا تھا اور نہ اُنھوں نے ہمیں۔ ہماری حالت ناگفتہ بہ ہوئی جا رہی تھی اور موصوفہ کے اشارے تیز سے تیز ہوتے جا رہے تھے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کیا موصوفہ کو اپنی بدنامی کا کوئی خوف نہیں ہے! وہ تو خیر گزری کہ ہم نے زمانے کے خوف سے اپنے آپ پر قابو رکھا اور اُنکے کسی اشارے کا جواب نہ دیا۔ لوگ کیا کہیں گے، اِس فکر نے ہمیں پریشان کر رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے محفل اختتام پذیر ہوئی۔ تالیوں کا ایک شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، لیکن پھر ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا کہ لوگ ہمارے برابر بیٹھے ہوئے شخص کو مبارک باد دے رہے ہیں۔ تب ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ موصوف اُس عظیم شاعرہ کے شوہر نامدار ہیں۔ اک ذرا سوچا اور پھر آگے بڑھ کر بڑی فراخ دلی کے ساتھ ہم نے بھی اُن کو مبارک باد دے دی!

جوئے لطافت از ابوالفرح ہمایوں

یوسف عالمگیرین

ڈاکٹر

ڈاکٹر کمال کا کیریکٹر ہے اُس کے گڈ یا بیڈ ہونے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہ صرف ایک کیریکٹر ہے۔ یہ وہی کیریکٹر ہے جس کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ بڑا ''کیریکٹر'' ہے بھئی۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر شروع سے ڈاکٹر نہیں تھا۔ یہ بعد میں بنا ہے۔ لیکن جب سے یہ ڈاکٹر بنا ہے لوگوں کی جان پہ بنی ہوئی ہے۔ کوئی مریض بیمار ہوا تو ڈاکٹر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ مختلف ڈاکٹروں کے پاس گیا جس ڈاکٹر کے ہاتھوں جتنے مریض ہلاک ہو چکے ہوتے' اُس کے کلینک پر اتنی ہی سرخ بتیاں جل رہی ہوتیں۔ کسی کی بیس بتیاں تو کسی کی تیس۔ صرف ایک ڈاکٹر کے کلینک پر ٹوٹل دو بتیاں تھیں مریض بہت خوش ہوا کہ یہ ڈاکٹر ٹھیک ہے۔ اس کے ہاتھوں کم مریض مرتے ہیں۔ اس نے جاتے ہی ڈاکٹر کی تعریف کی کہ آپ کے ہاتھوں بہت کم مریض فوت ہوتے ہیں اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ ڈاکٹر نے مریض کا شکریہ ادا کیا اور کہا بس آج صبح ہی کلینک کھولا ہے اور صبح سے آپ تیسرے مریض ہیں۔

جس ڈاکٹر کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ نہ تو ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے اور نہ ہی جانوروں والا ڈی وی ایم ڈاکٹر۔ لیکن ہے وہ ڈاکٹر ہی۔ اُس کا تعلق چونکہ انسانوں سے ہے اس لئے وہ بھی 'بندہ کش' ٹائپ ڈاکٹر ثابت ہوا ہے۔ اول الذکر ڈاکٹر مریضوں کی زندگیوں سے کھیلتا تھا آخر الذکر ڈاکٹر لوگوں کے کیریئر سے کھیلتا ہے۔ یہ بچپن میں سائیکل بھی خریدتا تو اس پر کیریئر نہیں لگواتا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شروع سے کتنا کیریئر کا نشیں رہا ہے۔ اسے کیریئر پسند ہے لیکن صرف اپنا۔ یہ خود کو پڑھا لکھا ڈاکٹر گردانتا ہے۔ لیکن یہ حلفیہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے سلیبس کے علاوہ کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ پڑھنے پڑا رہتا ہے۔ یہ لوگوں کو تحقیق کرواتا ہے لیکن خود تحقیق پر یقین نہیں رکھتا۔ اسی لئے لوگوں کے حوالے سے بہت آسانی سے بدظن ہو جاتا ہے۔ اگر یہ اس سے قبل تھوڑی سی بھی تحقیق کر لے تو یہ لوگوں سے بدظن ہونے سے باآسانی بچ سکتا ہے۔ یہ خود کو بلا کا محقق سمجھتا ہے جب کہ دوسرے اسے صرف بلا سمجھتے ہیں۔ وہ خالی خولی تحقیق پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کے پاس کوئی ریسرچر خالی ہاتھ چلا جائے تو وہ اُسے کھانے کو دوڑتا ہے۔ ریسرچر کے ہاتھ میں اپنا ریسرچ پیپر ہو تب بھی اسے خالی ہاتھ ہی تصور کرتا ہے لیکن اگر دوسرے ہاتھ میں پیزہ یا گفٹ ہو تو پھر پہلے ہاتھ میں بھلے ریسرچ پیپر یا تھیسز نہ بھی ہو اس کا کھلے دل سے استقبال کرتا ہے۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے اس ڈاکٹر کو پیزے کی خوشبو ہی بے قرار کر کے رکھ دیتی ہے لیکن اگر کوئی اچانک لارج سائز پیزے کے ساتھ اس کے دفتر کے اندر داخل ہو جائے تو پہلے سے بیٹھے ہوئے ریسرچر یا مہمان کو نہ صرف یہ کہ کولڈ شولڈر دیتا ہے بلکہ اسے یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتا کہ آپ آنے سے پہلے ذرا ٹائم لے لیا کریں۔

پیزے کا دیوانہ یہ ڈاکٹر جب پیزہ ایجاد بھی نہیں ہوا تھا تو

بچپن میں اپنے گاؤں کے تندور سے نان خرید کر اس پر بوٹیاں رکھ کر کھاتا تھا۔لیکن اسے یہ ادراک نہیں تھا کہ یہ پیزہ ہے۔ پیزے کا نام تو درحقیقت اُس نے شہر میں آ کر سنا اور رغبت اس وقت بڑھی جب غریب غرباء کی تحقیق اس کے آگے پھسنا شروع ہوئی۔ ویسے ڈاکٹر بہت فراخ دل آدمی ہے اگر کبھی کوئی پیزہ نہ بھی لا سکے تو وہ جو بھی لے آئے اسے قابل قبول ہوتا ہے۔ بوری بند بادام اور ڈرائی فروٹ بھی اسے بہت پسند ہیں۔

کوئی طالبہ اس کے پاس آئی کہ سر میں آپ کو اپنا تھیسز دے گئی تھی آپ نے دیکھ لیا ہو تو میں لے جاؤں تا کہ Cerrection کر کے جمع کروا دوں تو ڈاکٹر بگڑ کر کہنے لگا میں اتنی گرمی میں کیسے چیک کروں تھیسز جب موسم بہتر ہوا کر لوں گا۔طالبہ نے دو چار مزید چکر لگائے تو ڈاکٹر نے ایک ہی جواب دیا کہ میرے گھر میں گرمی بہت ہے۔طالبہ کھاتے پیتے گھرانے کی تھی۔اس نے فوراً ڈاکٹر کے گھر میں ایک سپلٹ اے سی لگوا دیا تو ڈاکٹر نے گھر کے ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بیٹھ کر طالبہ کو فون کر کے خوشخبری سنائی کہ آپ نے تو کمال کا تھیسز لکھا ہے بس آپ جمع کروا دیں۔آپ کو بہت مبارک ہو۔اسی طرح ایک اور طالبہ بتا رہی تھی کہ میں نے ڈاکٹر کی اہلیہ کو شاپنگ کروائی تھی تو میرا تھیسز فوراً پاس ہو گیا تھا۔

گویا ڈاکٹر بہت قناعت پسند ہے اور جیسے ہے جہاں ہے کی بنیاد پر جو ملتا ہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر اپنے ایک سٹوڈنٹ کی فرنیچر شاپ پر گیا اور آگ بگولا ہو کر واپس آیا کہ سٹوڈنٹ نے اس کو سیریس کلائنٹ سمجھتے ہوئے فرنیچر آئیٹمز کی صحیح قیمتوں سے آگاہ کیا تھا۔ہو سکتا ہے بعد میں سٹوڈنٹ مذکورہ کو کوئی چھوٹا موٹا ٹیبل نما تحفہ پیش کرنا ہی پڑا ہو۔

ڈاکٹر خود کو چونکہ ایک لائق فائق بندہ سمجھتا ہے لہٰذا اپنے سے کسی لائق فرد کو برداشت نہیں کرتا۔ ڈاکٹر کسی جگہ انٹرویو دینے گیا تو اس سے چند ایک ایسے سوالات پوچھے گئے جو اسے نہیں آتے تھے اس لئے ڈاکٹر آج تک اس انٹرویو پینل کی لعن طعن کرتا دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر کو شاید لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔وہ کسی کو دکھائی نہ بھی دے تو اوپر بیٹھی ہوئی اﷲ تعالیٰ کی ذات کو تو سب دکھائی دیتا ہے لیکن ڈاکٹر کو کون سمجھائے؟ وما علینا الا البلاغ

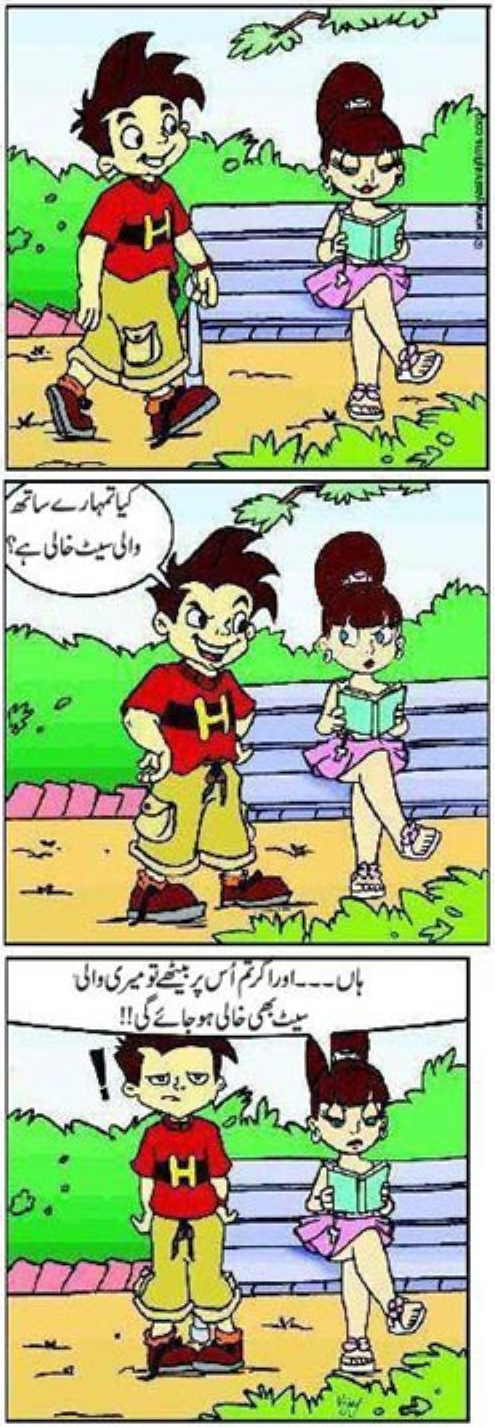

راشد اشرف

خلاؤں میں اُڑتی شاعری

کچھ عرصہ قبل پاکستان کے ایک ادبی جریدے میں کینیڈا میں مقیم شاعر و افسانہ نگار عبداللہ جاوید کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ مذکورہ شمارے میں عبداللہ جاوید اوران کی اہلیہ شہناز خانم عابدی کو قرطاس اعزاز پیش کیا گیا ہے۔ ایک علاحدہ گوشے میں عبداللہ جاوید کے طویل انٹرویو اور افسانے کے علاوہ عبداللہ جاوید کے کمال فن پر اقبال بھٹی، گلزار جاوید، ستیہ پال آنند، صابر وسیم، اے خیام، مبین مرزا، اکرام بریلوی و دیگر کی آراء شامل کی گئی ہیں۔ ادبی جریدوں میں مختلف شعراء و ادباء کے فن اور شخصیت پر خصوصی گوشے شامل کرنے کی روایت زور پکڑتی جارہی ہے۔ ہم ایسے گوشہ نشین شخص کے لیے تو یہ گوشے بہت معلوماتی ہوتے ہیں، اس طرح گھر بیٹھے بیٹھے گوشہ گمنامی میں پڑے کسی شاعر یا ادیب سے تعارف ہوجاتا ہے۔ لیکن اکتوبر ۲۰۱۱ میں کراچی میں ایکسپریس اخبار کے زیر اہتمام منعقد ہوئی عالمی اردو کانفرنس میں بھارت سے آئی محترمہ جیلانی بانو کا ان ادبی گوشوں کے بارے میں موقف سخت تھا، ان کے مطابق ادبی جرائد میں ان گوشوں کی تواتر کے ساتھ اشاعت پڑھنے والوں کو اکتاہٹ میں مبتلا کررہی ہے اور یہ تمام معاملہ ذاتی تعلقات کی بنیادوں پر انجام پاتا ہے۔

بعض لوگوں کے خیال سے ادبی گوشوں میں ادباء اور شعراء کو قید کرنے سے بہتر ان کی تصانیف کی تقریب رونمائی ہوٹل وغیرہ میں کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے، جہاں لذت کام و دہن کا بھی معقول انتظام رہتا ہے۔ فروری ۱۹۶۶ میں محترم شمس الرحمان فاروقی کے جریدے شب خون کی تقریب اجراء بھی الہ آباد کے گندور نامی ریسٹورنٹ میں منعقد کی گئی تھی۔ ۱۹ جون ۲۰۱۰ کو ٹورنٹو میں ممتاز ادیبہ شکیلہ رفیق کی آٹھویں کتاب 'وے صورتیں الٰہی' کی تقریب تعارف ٹورنٹو کے 'تندوری چکن ریسٹورنٹ' میں منعقد کی گئی تھی۔ کتاب میں جنس کے موضوع پر افسانے شامل ہیں، شاید اسی مناسبت سے یہ تقریب 'تندوری چکن ریسٹورنٹ' میں رکھی گئی تھی۔ کتابیں تو روزانہ درجنوں کے حساب سے شائع ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن ایسی جگہوں پر تقریبات منعقد کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شرکاء کو کتاب کے مندرجات بے شک یاد رہیں یا نہ رہیں، تندوری چکن کا ذائقہ ایک عرصے تک یاد رہتا ہے۔ یہاں ہزاروں میل دور کراچی میں بیٹھ کر ہم نے کتاب پڑھی اور تندوری چکن کا لطف پایا۔ تقریب مذکورہ کا حاصل عابدہ کرامت صاحبہ کا وہ تبصرہ تھا جس میں انہوں نے شکیلہ رفیق کے بارے میں فرمایا کہ "وہ منافقت کا دوپٹہ نہیں اوڑھ سکتی اور اگر ضرورتاً اوڑھنا ہی پڑے تو اس کے آنچل سے سر نہیں ڈھک سکتی"۔ شکیلہ رفیق صاحبہ نے کب اور کن موقعوں پر ضرورتاً منافقت کا دوپٹہ اوڑھا ہے، عابدہ کرامت نے ان کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ اس پر ستم یہ رہا کہ تقریب کے اختتام پر شکیلہ رفیق نے عابدہ کرامت کے بارے میں حاضرین کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ 'اتنا اندر سے تو انہیں ان کے اپنے بھی نہ سمجھ پائے جتنا عابدہ کرامت نے انہیں سمجھا ہے۔"

بات ہورہی تھی عبداللہ جاوید کی۔ جاوید صاحب کی کتاب

بیاد اقبال ۱۹۶۸ میں منظر عام پر آئی تھی، شاعری پر طبع آزمائی کا نتیجہ ۱۹۶۹ میں موج صد رنگ کی اشاعت کی صورت میں نکلا۔قلم آزمائی کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے اور ۲۰۱۰ میں ان کے افسانوں کا مجموعہ 'بھاگتے لمحے' کے عنوان سے شائع ہوا۔بعض حاسدوں کا کہنا ہے کہ یہ کتاب بھاگتے ہوئے لکھی گئی ہے اور بھاگتے ہوئے ہی پڑھی جانی چاہیے۔اس بھاگ دوڑ میں ہم کہاں سے کہاں نکل گئے، ذکر ہے عبداللہ جاوید کا بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب چہار سو عبداللہ جاوید کا ہی ذکر ہے۔

جریدے کے ابتدا میں شامل مصاحبہ گو نے عبداللہ جاوید کے شعر:

لاکھ اڑتی پھرے خلاؤں میں
فکر ہم شاعروں کی زد میں ہے

کا حوالہ دیا اور ان پر الزام لگایا کہ اس بارے میں وہ تعلّی کا شکار ہیں۔

جواب میں عبداللہ جاوید نے اپنے دفاع میں خلاؤں میں اڑتی فکر کا ہی سہارا لیتے ہوئے کہا کہ ''ہم شاعروں سے میری مراد اردو میں میر، غالب اور اقبال ہیں، دنیا کی دوسری زبانوں کے اکابر شاعر بھی ہیں، میں ان کی جوتیوں کے آس پاس کہیں ہونے کا عرض گزار رہوں۔''

خلاؤں میں اڑتی فکروں کا ہمہ وقت شاعر کی زد میں رہنا ایک قابل قدر دعویٰ ہے لیکن ساتھ ہی شاعر کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ خلاؤں میں اڑتی ہوئی چیزیں اکثر کشش ثقل سے باہر نکل جاتی ہیں اور شاعر تو ایک طرف رہے، سائنسدانوں کے قابو سے بھی باہر ہو جاتی ہیں۔ امریکیوں نے خلاؤں میں اڑتی ایسی چیزوں کو یو ایف او یعنی Unidentified Flying Object کا نام دیا ہے۔اردو اور دنیا کی دیگر زبانوں کے اکابر شعراء کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے اور اگر ان کی جوتیوں کو جمع کرلیا جائے تو ہزاروں کی تعداد بنتی ہے۔بہتر تو یہ ہوتا کہ ان شعراء کرام کے آس پاس رہنے کی کوشش کی جاتی نہ کہ ان کی ہزار ہا جوتیوں کے۔

شاعری درحقیقت ہے کیا، عبداللہ جاوید اس بارے میں مفاہیم و مطالب کو پانی پانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''شاعری وہ ہے جو لفظوں کے لبالب بھرے ہوئے کوزوں میں ہر عصر کی مکانی و زمانی حقیقتوں کے وجدان کو ممکنہ حد تک لامکانی و لازمانی وجدان کے ارتسامات سے برقیا کر، بوند بوند داخل کرے''۔

جناب عبداللہ جاوید نے ٹھیک ہی تو کہا ہے، کوزے میں ہر عصر کی مکانی و زمانی حقیقتوں کو برقیا کر بوند بوند داخل کرنے سے اس قسم کی معنی خیز شاعری وجود میں آتی ہے:

پھول پہ رکھ کر پاؤں
جب وا جانے مونچھ مروڑی

رویا سارا گاؤں

البتہ اس کلام سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ واجانے درحقیقت اپنی مونچھ مروڑی تھی یا گاؤں والوں کی۔ عبداللہ جاوید کی اس تین سطری نظم کو پڑھ کر گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ ان کا قاری بھی بے اختیار رو پڑتا ہے!

اس رجحان ساز انٹرویو میں عبداللہ جاوید مزید کہتے ہیں کہ'' میرے مزاج میں شہرت گریزی اتنی زیادہ ہے کہ جہاں دھما کہ کرنا لازمی تھا، وہاں بھی دھما کہ نہ کیا۔''

جناب عبداللہ جاوید نے دھما کہ نہ کر کے عقل مندی سے کام لیا ہے، صرف پاکستان ہی ایسی جگہ ہے جہاں آپ کہیں، کسی وقت بھی دھما کہ کر سکتے ہیں، کینیڈا میں اس قسم کی کوشش کے نتائج خطرناک ہوسکتے ہیں۔۔۔عبداللہ جاوید مزید فرماتے ہیں:

''میرا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۶۹ میں شائع ہوا، اس میں شامل نظموں اور غزلوں کو ساٹھ کی دہائی میں منظر عام پر آنے والے دیگر شعری مجموعوں کے مشمولات کے ساتھ رکھ کر دیکھنے پر میں خود بھی اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوجاتا ہوں کہ میرے پاس بہت کچھ ہٹا ہوا، اجنبی اجنبی سا، نیا نیا سا ہے۔ میں نے زبان کو اردو+ فارسی کی حدود سے ممکنہ حد تک باہر نکال کر اردو+ ہندی میں ڈھانے کی کوشش کی۔ موضوعات میں حسن قاتل کا موضوع میری نظموں کے واسطے سے اردو میں پہنچا۔ وقت کے موضوع پر میرے نظریات علامہ اقبال کے سلسلہ روز و شب کی موجودگی میں بھی ایک علیحدہ مقام بنا چکے ہیں۔''

عبداللہ جاوید ۱۹۶۰ میں کی گئی اپنی شاعری کو خود ہی اجنبی اجنبی سا قرار دے چکے ہیں۔ جن لوگوں نے جناب عبداللہ جاوید کے پہلے شعری مجموعے کا مطالعہ کیا ہے ان کا یہ خیال ہے کہ آج اکیاون برس گزر جانے بعد بھی یہ 'اجنبیت' اسی شان سے قائم ہے۔

انٹرویو لینے والے نے طرح طرح کے سوالات سے جاوید صاحب کو دق کیے رکھا، چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

❖ ۔احباب کی ایک معقول تعداد آپ کے تجربات کی طرف بھی توجہ دلایا کرتی ہے مگر نشان دہی کوئی نہیں کرتا کہ آپ کو کب، کہاں، کس نوعیت کے تجربات کا وقت میسر رہا؟

❖ ۔آپ کے یہاں الفاظ کا دائرہ اکثر بحور سے وسیع کیوں کر ہوتا ہے؟

❖ ۔کچھ لوگوں کے خیال میں آپ نے اپنی ایک دنیا بنالی ہے، جس سے باہر آنا آپ پسند نہیں کرتے

❖ ۔اگر کوئی شخص آپ کے کلام میں طنز، تلخی اور چراندھ کی نشان دہی کرے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

❖ ۔آپ کو مظہر جان جاناں، نیاز بریلوی، عبدالحئی تاباں اور میر درد کا سفیر گردانے والے کس امر کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں؟

❖ ۔آپ کے تخلیقی سفر میں طویل وقفے کی بابت قاری قطعی طور پر کیوں بے خبر ہے؟

❖ ۔کچھ لوگوں کے خیال میں آپ نے اپنی بیگم کو بطور افسانہ نگار تسلیم کرانے کی غرض سے خود کو افسانہ نگاری سے اس وقت تک دور رکھا جب تک بیگم صاحبہ مستند افسانہ نگار تسلیم نہ کر لی گئیں؟

جناب عبداللہ جاوید ان سوالات سے ہرگز پریشان نہیں ہوئے بلکہ اپنے جوابات سے انہوں نے قاری کو پریشان کر دیا، چند متفرق مثالیں ملاحظہ ہوں:

❖ ۔میری شاعری، میرے افسانے اور میری تحریر قاری کو میری اپنی دنیا میں لے آتی ہے، مجھے اور کیا چاہیے۔

❖ ۔قاری ہی کو تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے سمجھنا پڑے گا، اگر ہر قرات پر قاری مجھ میں کچھ نیا دریافت کرے گا تو اس کو نئی حیرانی اور نئی خوشی ملے گی۔

❖ ۔میر درد تکیہ صوفی بزرگ تھے، میں بھی تصوف سے عملی طور پر جڑا ہوں لیکن پورا شاعر ہوں۔ میر نے درد کو آدھا شاعر مانا تھا۔

❖ ۔میں خود بھی نہایت چھوٹے درجے کا صوفی ہوں اور وہ بھی صوفیائے ملامیہ کے اڑوس پڑوس والا۔

❖ ۔مجھے زیادہ سطح کے اوپر اوپر ہی دیکھا اور جانچا جا رہا ہے۔

جناب عبداللہ جاوید کا یہ کہنا کہ ’قاری ہی کو تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے سمجھنا پڑے گا اگر ہر قرات پر قاری مجھ میں کچھ نیا دریافت کرے گا تو اس کو نئی حیرانی اور نئی خوشی ملے گی‘، قاری کو ایک کٹھن امتحان میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ گویا مظلوم قاری کو دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں ہے، دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ قاری کو شاعر پہلی کوشش میں ہرگز سمجھ میں نہیں آئے گا، اسے اپنی تمام مصروفیات کو پس پشت ڈال کر شاعر کو روزانہ تھوڑا تھوڑا سمجھنا چاہیے، شاید وہ دس بیس سال میں وقفے وقفے سے کچھ سمجھ پائے اور جب جب ایسا ہوگا، بقول شاعر، قاری کو ایک نئی حیرت اور نئی خوشی ملے گی، یہاں اس بات کا ڈر لاحق ہوتا نظر آرہا ہے کہ اس قدر ان گنت خوشیاں سمیٹتے سمیٹتے کہیں قاری شادی مرگ کی کیفیت سے دوچار نہ ہو جائے۔

جناب عبداللہ جاوید کے مذکورہ بالا بیانات کو پڑھ کر صوفیہ ملامیہ کے اڑوس پڑوس سے تعلق رکھنے والے بہت سے حاسدوں نے کہا کہ جناب شاعر کی شاعری کو علامتی نہیں بلکہ ’ملامتی‘ کہا جائے تو بہتر ہوگا، لیکن ہم ایسی شر پسندانہ باتوں پر سے کان ہی نہیں دھرتے۔ البتہ جاوید صاحب کے اس دعوے پر کہ وہ میر درد کے مقابلے میں آدھے نہیں پورے شاعر ہیں، ہمیں ان کے درج بالا آخری دعوے کی اصل وجہ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے۔ جس میں وہ گلہ کرتے ہیں کہ ”مجھے زیادہ سطح کے اوپر اوپر ہی دیکھا اور جانچا جا رہا ہے“۔ لیکن چونکہ اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد ہمیں جناب عبداللہ جاوید سے ایک اپنائیت سی محسوس ہونے لگی تھی لہٰذا ہم نے ان کی شاعری کی اوپری سطح کو چھوڑ کر اس کی تہہ میں غوطہ لگایا اور چند ’آبدار موتی‘ چنے جنہیں خوب جانچ کر یہاں پیش کر رہے ہیں

سنڈی سے
تتلی کے قالب میں آجانا
پھر سنڈی بن جانا
مر جانا
تتلی بن کر اڑ جانا

☆

میرے اندر بھی کوئی ناچتا ہے
میں اس کے ساتھ پیارے رقص میں ہوں

☆

فلک پر جب ستارے ٹوٹتے ہیں
زمیں پر دل ہمارے ٹوٹتے ہیں

☆

پھول کے چوکیدار
رنگ و بو پر پہرے وہرے
سب کے سب بے کار

ان اشعار کو پڑھ کر شاعر کے ”کوزے میں ہر عصر کی مکانی و زمانی حقیقتوں کے وجدان کو برقیا کر بوند بوند داخل کرنے“ کی بات تو ایک طرف، خود قاری کے جسم میں ایک برقی رو سی دوڑ جاتی ہے۔ البتہ سنڈی اور تتلی والے بیان میں ہمیں جناب عبداللہ جاوید کا یہ کہنا کہ ’قاری ہی کو تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے سمجھنا پڑے گا‘ درست معلوم ہو رہا ہے۔ ہمیں تتلی اور سنڈی کے ہیر پھیر کے باب میں بادی النظر میں تو کوئی نئی حیرانی اور نئی خوشی والی بات نظر نہیں آئی لیکن پھر مزید غور کرنے سے یہ سمجھ میں آیا کہ یہ دراصل ’زولوجی‘ یا علم الحیوانات سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی عمیق گتھی ہے جس کو سلجھانے پر علم الحیوانات کی دنیا ہی کا تحقیق سے متعلق کوئی بڑا انعام ملنے کی امید رکھی جا سکتی ہے۔

بحیثیت قاری، ہم جناب عبداللہ جاوید کی شاعری پڑھ کر خوش تو کم ہوئے البتہ حیران زیادہ ہوئے ہیں۔ رہا سوال قاری کا جناب شاعر کی دنیا میں چلے جانے کا، تو عرض یہ ہے کہ قاری اپنی ہی دنیا میں خوش ہے، ایسی جگہ جا کر وہ کیا کرے گا جہاں شاعر کا کلام اور اس کی تخلیقات چوری ہو جاتی ہوں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ انٹرویو میں ایک جگہ جناب عبداللہ جاوید بیان کرتے ہیں کہ ”جاوید یوسف زئی کے قلمی نام سے اپنے شائع شدہ افسانوں کی ایک فائل اپنے ساتھ (کینیڈا) لایا تھا وہ غائب کر دی گئی۔ اس کے بعد جب بھی کوئی افسانہ لکھا، کسی پرچے میں بھجوانے سے پہلے ہی گم ہو گیا۔ انگریزی زبان میں براہ راست ٹائپ کیے ہوئے چار

چھ افسانوں کا بھی یہی انجام ہوا''

اس دنیا میں لوگوں پر کیسے کیسے روح فرسا سانحے گزر جاتے ہیں، اس کا اندازہ ہمیں مندرجہ بالا واقعے کو پڑھ کر ہوا، اسے پڑھ کر ہم آبدیدہ ہوگئے، جب طبیعت کچھ سنبھلی تو بے اختیار خامہ بگوش کی یاد آگئی ۔ وہ اسی سے ملتا جلتا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چند برس قبل اتفاق سے ایک مشہور ادیب کے گھر میں آگ لگ گئی۔ ان کے کتب خانے کی بہت سی نادر کتابیں جل گئیں۔ کئی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی جل کر خاک ہوگئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے دوست اظہار ہمدردی کے لیے ان کے ہاں پہنچے۔ ہر دوست نے اپنی بساط کے مطابق آتش زدگی کے واقعے پر اظہار افسوس کیا۔ البتہ ایک دوست نے منفرد انداز سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے لیکن یاد رکھیے کہ ہر شر میں کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو ہوتا ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوس ناک ہے، وہیں آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔ یقیناً یہ آپ کا نقصان ہے لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے محفوظ ہوگئے۔''

خامہ بگوش کے بیان کردہ اس واقعے پر تبصرہ در تبصرہ مناسب نہ ہوگا، البتہ ہمیں جاوید صاحب سے یہ شکایت ہے کہ انہوں نے شاعری کرتے وقت طبیعیات کے بنیادی اصولوں کا خیال نہیں رکھا۔ کشش ثقل کے اصول کے عین برخلاف یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ کس کے اشک ہیں اوج فلک تک
کوئی روتا رہا ہے رات بھر کیا

خامہ بگوش کے چہیتے استاد لاغر مراد آبادی اب مزید لاغر ہوچکے ہیں، گاہے گاہے ہم ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے ہیں، جاوید صاحب کے مذکورہ بالا شعر کو بھی استاد کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے تیوری پر بل ڈال کر فرمایا: ''میاں! اشک ہمیشہ نیچے کی طرف رخ کرتے ہیں، وہ آہیں ہیں جو اثر لانے کو

ٹوٹکے

۱۔ **گوشت کو مکھیوں سے بچانا** گوشت کو پانی میں اس طرح دھوئیے کہ اُس کی ساری مٹھاس دور ہو جائے اور پھر مکھیوں کو جالی دار جگہ میں بند کر دیجئے۔

۲۔ **جھینگر بھگانے کا طریقہ** گانے کی مشق کیجئے۔ خوب تانیں لگائیے، جھینگر بھاگ جائیں گے اور پھر کبھی آپ کے گھر کا رُخ نہیں کریں گے۔

۳۔ **جگر ٹھیک کرنے کی ترکیب** خواجہ دل محمد کے دیوان کا مطالعہ کیجئے اور اگر دل کی بیماری ہو تو جگر کے اشعار پڑھیئے اور اگر دونوں امراض ہوں تو کسی نوحہ گر کو ساتھ رکھیئے۔

۴۔ **چہرے کی جلد کی شکن دور کرنا** استری پھیرتے رہنے سے جلد کی شکنیں دور ہو جاتی ہیں۔

بات سے بات از **نصر اللہ خان**

آسماں کی طرف جاتی ہیں۔ اصول کشش ثقل کا بانی اگر یہ شعر سن لیتا تو گمان ہے کہ رات بھر روتا ہی رہتا۔''

جاوید صاحب نے ایک جگہ لطیف انداز میں شمشان گھاٹ کے مسائل کو بھی عمدگی سے شعری زبان میں ڈھالا ہے:

پھول دشمن کے ہوں یا اپنے ہوں
پھول جلتے نہیں دیکھے جاتے

اور آخر میں جناب عبداللہ جاوید کی وہ تخلیق ملاحظہ ہو جسے ڈاکٹر الیاس عشقی نے مرزا غالب کے ہم پلہ قرار دیتے ہوئے غالب کے دشت امکاں کو دائرہ امکاں میں ڈھالنا قرار دیا تھا:

پانی
بادل کا
اونچے سے اونچا
جاتا بھی ہے
نیچے سے نیچے
آتا بھی ہے

غالب کے دشت امکاں کو جس طرح پانی سے بھرے بادلوں کی مدد سے سیراب کیا گیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال ہمیں تو نہیں ملی اور شاید ڈاکٹر الیاس عشقی کو بھی نہ مل پاتی۔ مذکورہ مضمون میں ڈاکٹر عشقی نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ 'عبداللہ جاوید کو ناگزیر الفاظ کس آسانی سے مل جاتے ہیں'، حیرت و استعجاب کے اسی عالم میں ڈاکٹر عشقی نے جناب عبداللہ جاوید کی یہ تخلیق درج کی تھی:

دریا میں رہنا بھی ہے
بہنا بھی ہے
پل پل کچھ کرنا بھی ہے
بھرنا بھی ہے
فصل غم بونا بھی ہے
ڈھونا بھی ہے
مرنے سے ڈرنا بھی ہے
مرنا بھی ہے

حضرت جوش ملیح آبادی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے کہ جیسے چاہیں انہیں استعمال کریں۔ مذکورہ بالا کلام میں بہنا بھی ہے، ڈھونا بھی ہے، بھرنا بھی ہے، کرنا بھی ہے جیسے الفاظ کی تکرار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے ممدوح کے سامنے الفاظ صرف ہاتھ ہی نہیں بلکہ پاؤں بھی باندھے پڑے رہتے ہیں کہ کہ جیسے اور جب چاہیں انہیں استعمال کریں۔ مذکورہ انٹرویو میں فیض احمد فیض کا ذکر بھی آیا، جواباً، عبداللہ جاوید کی سعادت مندی تو دیکھیے کہ احتراماً وہ فیض کا نام لینے سے بھی گریزاں نظر آئے:

سوال: ''تراجم کے حوالے سے آپ پر کچھ ذمہ داریاں لازم تھیں، کم از کم میر، غالب، اقبال اور فیض کا آپ پر کچھ حق تو بنتا ہے''؟

جواب: ''اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا میرے بس کا کام نہیں تھا۔ یہ آپ نے ایک سانس میں تین ناموں میر، غالب اور اقبال کے ساتھ چوتھا نام کیسے لے لیا۔ کم از کم مجھ سے تو نہ لیا جائے گا۔ معذرت۔''

انٹرویو کا نچوڑ عبداللہ جاوید کا وہ تبصرہ ہے جس میں انہوں نے اپنی تمام ادبی سرگرمیوں کا مقصد ایک مختصر جملے میں بیان کر دیا، سوال تھا کہ 'ایک ہی وقت میں روایتی اور عطفی تراکیب کا استعمال قاری کو متجسس کیوں کرتا ہے؟' ۔۔۔۔۔۔ عبداللہ جاوید کا جواب تھا: ''قاری کو تنگ جو کرنا ہوا''۔

جناب عبداللہ جاوید کی اس بات کے جواب میں عرض ہے کہ قاری کو اتنا تنگ کرنا ٹھیک نہیں، اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے، اگر قاری تنگ آمد بجنگ آمد کے محاورے پر عمل کر بیٹھا تو حالات کے نازک ہو جانے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ ہمارے قارئین ہمارے اس مضمون کو پڑھ کر یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ ہم ایک کے بعد بات سے بات نکالتے چلے جا رہے ہیں اور ان کو غور کرنے کا موقع فراہم کر ہی نہیں رہے، لہٰذا اس تاثر کو زائل کرنے کے لیے ہم زیر تذکرہ انٹرویو سے ایک سوال اور جناب عبداللہ جاوید کا جواب درج کرتے ہوئے اس پر تبصرے کا موقع اپنے پڑھنے والوں کو فراہم کر رہے ہیں:

سوال: ''عیسیٰ، حسین، سقراط، بقراط، کرشن، سدھارتھ کو آپ نے اندر کا مکیں کیونکر بنا لیا، اگر بنا لیا تو اُن سے کس طرح کی قربت اور فیض حاصل کیا''؟

جواب: ''قبضہ مافیا کے لوگ ہیں، مجھ پر قابض ہو گئے۔ جلال الدین رومی کے نام کا اضافہ فرمالیجیے۔''

بزرگ شاعر جمیل الدین عالی نے عبداللہ جاوید کے ایک تنقیدی مضمون کے بارے میں تبصرہ (روزنامہ جنگ۔ ۲۲ ستمبر ۲۰۱۱) کرتے ہوئے کہا تھا: ''عبداللہ جاوید کے تنقیدی مضمون کو پڑھتے پڑھتے اپنی اس پیرانہ سالی کے باوجود مبہوت ہو کر رہ گیا ہوں۔ کاش اسے پڑھا جا سکے''۔

عالی صاحب نے آخری جملے میں یہ کہہ کر گویا بات ہی ختم کر دی کہ ''کاش اسے پڑھا جا سکے۔''

جناب جمیل الدین عالی اس پیرانہ سالی میں بھی غضب کے بذلہ سنج ہیں!

اسد قریشی

جھوٹ

جھوٹ کیا ہوتا ہے؟ جھوٹ کسی بھی بات یا جملے کی عارضی زندگی کو کہتے ہیں۔ یہ اُس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک پکڑا نہ جائے۔ کتابوں کے مطابق اس کی عمر زیادہ نہیں ہوتی اور عینی شاہدین سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس کے پاؤں نہیں ہوتے، لیکن مشاہدات و تجربات سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ اس کی عمر بھی طویل ہوتی ہے اور دنیا میں اسی فیصد جھوٹ کو پسند کیا جاتا ہے، بقیہ بیس فیصد لوگ جو کہ اسے پسند نہیں کرتے یا تو زندگی میں ناکام رہتے ہیں یا پھر خبط الحواسی کے مرض میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ عہدِ گزشتہ میں اِسے انتہائی معیوب اور اخلاق سے گرا ہوا سمجھا جاتا تھا لیکن آج یہ دورِ حاضر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ، وقت کی اہم ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ کاروباری مراکز، سرکاری اداروں، امراء، وزراء، روٗساء، وکلاء، یہاں تک کہ اساتذہ میں بھی اس کی کافی قدرومنزلت پائی جاتی ہے۔ کاروبارہ حضرات کا یہ ماننا ہے کہ اس کے بغیر کاروبار چل نہیں سکتا، جبکہ وزراء اور سرکاری اہکاروں کا نظریہ یہ ہے کہ "سچ بول کر اپنی گردن کٹوانے کا شوق نہیں۔"

آج کے دور میں جہاں جھوٹ کی اہمیت اس قدر پائی جاتی ہے، اس کی افزائش کا مؤثر ترین ذریعہ موبائل فون ہے۔ کوئی شخص چاہے دوسرے کمرے میں ہی کیوں نہ بیٹھا ہو، بآسانی کہہ دیتا ہے کہ "میں تو اِس وقت بہت دور ہوں"۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اور! سوری!! وہ میرا موبائل گاڑی میں رہ گیا تھا اس لئے آپ کی کال وصول نہ کرسکا"۔ سرکاری اہلکار اور وزراء بھی اس کی پرورش میں فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ اساتذہ اپنے فرائض سے جان چھڑانے کو اور وکلاء اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اس کا استعمال کرتے ہیں۔

جھوٹ خواتین میں بھی خاصا مقبول ہے اور شوہر حضرات کے لئے بھی یہ انتہائی اہم ہدایات میں سے ایک ہے کہ وہ اپنی بیوی سے جھوٹ ہی بولیں کیونکہ اکثر خواتین کا معدہ اس کا متحمل نہیں ہوتا۔ خواتین اس کا استعمال بالخصوص اپنی عمر کے سلسلے میں زیادہ کرتی ہیں اور مرد حضرات اپنی تنخواہ کے سوال پر۔

جھوٹ بولنا ایک فن بھی گردانا جاتا ہے اور اکثر نوجوان نسل اس فن میں ماہر پائی گئی ہے۔ جھوٹ ہم ہر کسی سے بول سکتے ہیں لیکن والدین سے جھوٹ قطعاً نہیں بولنا چاہیئے کہ اس کے نتائج انتہائی حد تک خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ بیچ بازار میں یا گھر میں جھوٹ کھُل جانے کی صورت میں طبیعت سے مرمت کے بھی امکانات ہیں۔ ولدین کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کے سامنے جھوٹ بولنے سے اجتناب کریں کہ بچے اپنے بڑوں کے ہی نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ جھوٹ کی بنیاد پر بنی عمارت زیادہ دیر تک ٹِک نہیں سکتی۔

کے ایم خالدؔ

ادا ۔ رے

شہریوں کی حفاظت صحت اوران کی بنیادی اوردیگر ضررویات کے لئے حکومت نے ادارے تشکیل دیے ہیں۔اگرکوئی ادارہ ہمارے قلم کی ذد سے محفوظ رہے تو ہم ان سے پیشگی ''معذرت خواہ'' ہیں۔

پولیس

دور قدیم میں حکومت کوشہریوں کی حفاظت کے لئے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔مگر جب سے پولیس کا محکمہ ایجاد ہوا ہے۔حکومت کوشہریوں کی جانب سے سکون ہے ،اب پولیس جانے اورشہری جانیں۔پولیس کا سلوگن ہے''پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی''اور یہ مدد عموماً نیوٹن کے تیسرے قانون حرکت''عمل اور ردعمل آپس میں برابر مگر مخالف سمت میں ہوتے ہیں'' کے مصداق ہوتی ہے۔مدد کے لفظ سے مراد''امداد باہمی'' ہے۔اگر آپ نے نیوٹن کے قانون کے تحت ان کے کہنے پر''عمل'' کرلیا تو پھران کا''ردعمل'' آپ کے مخالفین کے لئے کافی ''اوکھا'' ثابت ہوگا اگر''عمل'' سے قبل ہی مخالفین کی جانب سے''ردعمل'' ہوگیا تو بے چارہ نیوٹن کہاں ہماری پولیس کا رونا روئے گا۔

ہماری پولیس کی دہشت اور دبکے سے ہرکوئی واقف ہے ہمارے ملک میں پولیس اورتھانے دہشت کی علامت یہی وجہ ہے کی فلموں میں پولیس کو ہیرو کی جانب سے مار پڑنے پر ہم کتھارسس محسوس کرتے ہیں۔

کسی ملک کے جنگل میں ایک آدم خور شیر نے دہشت پھیلا رکھی تھی۔پاکستانی پولیس کوایک ٹارگٹ کے تحت بلایا گیااور ایک ہی رات میں ہوآدم خور شیر پکڑا گیا۔ہوا کچھ یوں کہ شیر کی گرفتاری کے لئے پولیس پارٹی جنگل میں گئی انہوں نے آو دیکھا نہ تاؤ ایک ہاتھی کوپکڑا اوراس پرتشدد شروع کردیا۔ہاتھی نے چنگاڑنا شروع کر دیا وہ بے چارہ گنے چوس رہا تھا''بھائی!میرا قصور کیا ہے؟''

''تم بندے کھاتے ہو۔''

''حضور میں ہاتھی ہوں ایک بے ضرر سبزی خور جانور یہ دیکھو میں توگنے کھا رہا ہوں'' ہاتھی نے گنےان کودکھاتے ہوئے کہا۔

نہیں،تم شیر ہواس بات کوتسلیم کرو''۔

جناب میں ہاتھی ہوں۔ہے الف ہا۔تھے یے تھی ۔ہاتھی بچوں کی سائنس اورمعاشرتی علام کی کتابوں میں میرا تعارف ہے'' ہاتھی نے روتے ہوئے کہا

''نہیں،تم تسلیم کروتم شیر ہو۔''

''میں جناب ہاتھی ہوں۔'' ہاتھی کی چنی سی آنکھوں سے زاروقطار آنسوگررہے تھے۔

"اس پر تھرڈ ڈگری اپلائی کرو"۔ افسر غرایا

یہ ساری کاروائی جھاڑیوں میں شکار کی غرض سے گھات لگائے شیر بخوبی دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسے ان کالی وردی والوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ہاتھی چلا چلا کر کہہ رہا تھا ۔"ہاں میں شیر ہوں، میں نے چالیس بندے کھائے ہیں"۔ ہاتھی کو جب گرفتار کر کے جنگل سے باہر لایا گیا تو تب بھی اس کی زبان پر یہی الفاظ تھے۔ وہاں پر موجود لوگوں نے یہ دیکھ کر کہا "یہ ہاتھی ہے جناب شیر نہیں"۔ مگر پولیس نہ مانی۔ اس واقعے کے ٹھیک آدھ گھنٹے بعد آدم خور شیر نے جنگل سے باہر آ کر گرفتاری دے دی۔ وہ اپنی شناخت کے لئے ان بندوں کی ہڈیاں بھی لایا تھا جن کو اس نے کھایا تھا۔

میونسپل کارپوریشن

میونسپل کارپوریشن شہر سے گندگی اٹھانے کی ذمہ دار ہے اور اس کی کارکردگی کا یہ حال ہے کہ سوائے چند پوش علاقوں کے گندگی کے ڈھیر آپ کا منہ چڑا رہے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں کر لو جو کرنا ہے۔ یہ الگ بحث ہے یہ منافع کن کو بخشتا ہے۔ یورپی ممالک میں کوڑے سے بہت سے کام لئے جا رہے ہیں، بجلی بنائی جا رہی ہے ،کھاد بنائی جا رہی ہے۔ مگر ہمارے ہاں کوڑے سے صرف دشمن کو زچ کیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر آپ نے خاکروب کی خدمت کر دی تو ٹھیک اور اگر وہ اپنی اس خدمت سے مطمئن نہ ہوا تو پھر آپ کا اپنا گند آپ کا جینا دوبھر کر دے گا۔ اور آپ اس کی منتوں پر اتر آئیں گے۔

ایک وقت تھا جب مچھر اتنا طاقتور نہیں تھا۔ آپ اسے چٹکی سے مسل بھی سکتے تھے۔ آج کے دور میں مچھر طاقتور ہو گیا ہے شائد کارپوریشن کی ڈی ٹی ڈی اس کے لئے وٹامن ثابت ہو رہی ہے۔ بے غیرت کے منہ میں دانت بھی انسان سے سے زیادہ ہیں۔ آپ مچھر سے بچاؤ کے لئے میٹ لگائیں جلیبی دکھائیں، فنس چھڑ کائیں یا جسم پر جل لگائیں۔ ان سب اقدامات کے باوجود یہ آپ کے کان میں الاپ گروپ کی طرح چیخ کر کہے گا "بس"۔ اور آپ یقیناً آپ اس کی اس بات پر جل بن جائیں گے۔ جدید تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے دولہا راجہ آپ کے کان میں باجا بجائیں گے اور دلہن رانی آپ کو کاٹے گی کیونکہ اپنی نسل کی بڑھوتری کے لئے اس کو آپ کے خون کی اشد ضرورت ہے۔

پچھلے دور کا مچھر ابن آدم کو صرف ملیریا میں مبتلا کرتا تھا۔ چند دن ہانپ کانپ کر بندہ تندرست ہو جاتا تھا اب انہوں نے اپنی ایک نئی نسل ایجاد کر لی ہے جس کو ڈینگی مچھر کا نام دیا گیا ہے۔ صاف پانی پر پلنے والا یہ مچھر انسانی بقا کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ پہلے گندے پانی کو جلد از جلد ٹھکانے لگانے کا سوچا جاتا تھا اب صاف پانی بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا غلیظ پانی۔ کارپوریشن کے ملیریا سپر وائزر صرف تنخواہیں وصول کرنے میں مصروف ہیں نہ تو ان میں پہلے جیسا مچھر سے مقابلے کا رجحان ہے اور نہ وہ لنگوٹ کس کر اس کے مقابلے پر آتے ہیں۔

واسا

پانی کی فراہمی اور اور نکاسی کے لئے ہر شہر میں واسا کا ادارہ کام کر رہا ہے جو واسا کم اور "دلاسا" زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ نہ جانے اسے اکٹھی دو ڈیوٹیاں کیوں سونپی گئی ہیں پانی اور سیوریج۔ ان دونوں ڈیوٹیوں کو انہوں نے اس طرح یکجا کر دیا ہے کہ حیرانی ہوتی ہے ایک ہی لائن سے دونوں کام کئے جا رہے ہیں۔ اس "ٹو ان ون" کام سے واسا کی آمدنی میں اضافہ ہو نہ ہو شرح اموات میں ضرور اضافہ ہوا ہے اور یوں ملک الموت نے اپنے حصے کا کام بھی ان کو تفویض کر دیا ہے۔

واسا کی اس "کارکردگی" کے باعث ہیپاٹائٹس کا مرض وطن عزیز کے طول وعرض میں پھیل چکا ہے ہمارے ایک دوست کو یرقان کی معمولی سی شکایت ہوئی وہ ٹسٹ کروانے ہسپتال پہنچے ۔ڈاکٹر صاحب نے ان سے پوچھا "کیا تکلیف ہے۔"

''معمولی سا یرقان ہے''

پانی کونسا استعمال کرتے ہیں۔''

''جی میں معمولی شہری ہوں، منرل واٹر نہیں پیتا۔''

جی نہیں، میرے کہنے کا مقصد ہے زمینی یا سرکاری۔''

''سرکاری پانی پر موٹر لگا رکھی ہے وہی استعمال کرتے ہیں۔''

''تو پھر ٹسٹ کروانے کی کیا ضرورت ہے آپ کو کالا یرقان ہے اللہ کا نام لے کر دوائی شروع کریں۔

ہم نے یہاں قارئین کی گوناگوں مصروفیات کو مدنظر رکھتے ہوئے خود ہی واسا کی کارکردگی کے بارے ایم ڈی واسا سے ایک خیالی انٹرویو کیا، خیال رہے کہ یہ انٹرویو خیالی ہے اوریجنل شائد اس بھی زیادہ مذیدار ہو۔

آئیں جناب! تشریف رکھیں۔'' ایم ڈی واسا نے کرسی سے اٹھ کر میرا استقبال کیا

''آپ کوئی صحافی ہیں''۔ ایم ڈی صاحب بغل میں دبی فائل اور ہاتھ میں پکڑی بوتل کو دیکھ کر کہا۔

''نہیں جناب! میں ایک معمولی شہری ہوں''

اس پر ایم ڈی صاحب نے ناک بھوں چڑھایا'' میں سمجھا کوئی صحافی ہو، بہر حال بتاؤ کیوں آئے ہو۔''

''جناب! آپ کے پانی کی شکایت لے کر حاضر ہوا ہوں۔'' میں نے ان کے سامنے پانی کی شفاف بوتل رکھتے ہوئے کہا

''پانی تو بہت صاف ہے، کون سے علاقے سے آئے ہو۔''

''مصری شاہ سے۔''

مصری شاہ میں اتنا شفاف پانی، اتنا صاف پانی تو ہم گلبرگ میں بھی سپلائی نہیں کرتے۔ اس سے آپ کو یقین ہو جانا چاہیے کہ حکومت امیر اور غریب کے فرق کو مٹا دینا چاہتی ہے۔'' انہوں نے چہکتے ہوئے کہا

''یہ اس صاف پانی کی رپورٹ ہے۔'' میں نے فائل ان

بٹ گمانیاں

☆ عام طور پر ایک ہی خریدا جاتا ہے لیکن اگر آپ کبھی دو تربوز اکٹھے خریدیں تو لازمی طور پر آپ کے ذہن میں شریف برادران کا خیال آئے گا۔

☆ چوہا ہمیشہ چوہا ہی رہتا ہے لیکن اس کے کردار پر اُس وقت حرف آتا ہے جب وہ دُم پر کھڑا ہو جائے۔

☆ میاں صاحب کہتے ہیں کہ بعض اوقات گھر والی ایسی کام والی رکھ لیتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کام والی گھر والی ہو اور گھر والی کام والی۔

☆ میاں صاحب کہتے ہیں کہ لڑکیاں آپ کو اس لئے ہی اسمارٹ اور خوبصورت نظر نہیں آتیں کہ وہ اسمارٹ ہوتی ہیں بلکہ ایسا اس لئے ہے کہ بیویاں موٹی موٹی ہوتی ہیں۔

☆ فلم اسٹار صائمہ ہال میں داخل ہوئیں تو بیشتر مرد ہونقوں کی طرح ایسے انہیں تکنے لگے جیسے شکر کے مریض چونسا آم حسرت سے دیکھتے ہیں۔

(خرم بٹ)

کے سامنے کر دی۔

انہوں نے فائل کو کھول کر رپورٹ پڑھی اور مسکرا دیے "اس میں کوئی خاص بات۔" انہوں نے رپورٹ کو لہراتے ہوئے کہا۔

"جناب! اس میں سیسہ دریافت ہوا ہے۔"

اگر سیسہ انسانی صحت کے لئے خطرناک ہے تو یہ کیوں کہتے ہو سیسہ پلائی دیوار بن جاؤ۔"

جناب عالی! اس میں لوہا بھی ہے" میں نے چڑتے ہوئے کہا

بھئی حکیموں کے آگے پیچھے پھرتے ہو ہمارے جسم کو فولادی بنا دو، لوہے ہی کو فولاد اور انگلش میں آئرن کہتے ہیں جتنے بھی بچوں کے دودھ اور بڑوں کے سپلیمنٹ ہیں ان سب میں آئرن شامل ہے اور اگر یہ ہمارے پانی میں ہے تو یہ اس کی اضافی خوبی ہے۔"

"جناب! اس میں 0.001 فی صد پارہ بھی ہے۔"

"یہ کہ کر میرا پارہ نہ چڑھاؤ، پارے کا انسانی جسم میں بہت بڑا کردار ہے یوں سمجھوں کم عقل، کہ بلڈ پریشر کا بڑھنا، پارہ کا بڑھنا ہے۔ اور بلڈ پریشر کا لو رہنا، پارے کی جسم میں کمی کی علامت ہے، کیونکہ تم نے وہ مشہور فقرہ پڑھا ہو گا خون پارے کی طرح میرے جسم میں دوڑنے لگا۔ اور کچھ" انہوں نے مجھے چڑایا

"میں نے یہ بوتل ڈائریکٹ ٹونٹی سے اس کا منہ لگا کر بھری ہے اسے ذرا سونگھیں لیبارٹری رپورٹ کے مطابق اس میں ہائڈروجن سمیت چند دوسری گیسیں بھی خارج ہوئی ہیں۔"

واسا نے تم سے کب کہا ہے پانی ڈائریکٹ پیو، ٹینکی سے لے کر تمہارے گھر تک نہ جانے ہمارے پائپ کن کن گٹروں اور کون کونسی جگہوں سے گزرتے ہیں، پائپوں میں جب پانی نہیں ہوتا تو نہ جانے اس میں کون کونسی گیسیں بسیرا کر لیتی ہیں۔ پانی کو تحمل سے پیو گیسیں خود ہی خارج ہو جائیں گی۔ یہ بتاؤ سائنس پڑھے ہو۔"

"جی ہاں، میٹرک سائنس کے ساتھ ہوں۔" میں نے زچ ہو کر کہا

"پانی کا فامولا بتاؤ۔"

"H2O"

ایک حصہ آکسیجن اور دو حصے ہائڈروجن۔"

"آپ نے اکثر پائپوں سے سڑسڑ کی آواز سنی ہوں گی، وہ ہماری طرف سے دو حصے ہائڈروجن کی سپلائی ہوتی ہے جو فضا میں موجود آکسیجن کے ساتھ مل قطرہ قطرہ پانی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر واسا آپ کو دو حصے ہائڈروجن سپلائی کرتا ہے تو کیا اپنی جانب سے ایک حصہ آکسیجن شامل نہیں کر سکتے۔ ہائڈروجن کے ساتھ ساتھ ہم آپ کو فولاد، پارہ اور سیسہ مفت میں دے رہے ہیں۔" ایم ڈی واسا نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے اپنی رپورٹ بغل میں دابی، پانی کی بوتل کو مضبوطی سے پکڑا اور باہر نکل آیا۔

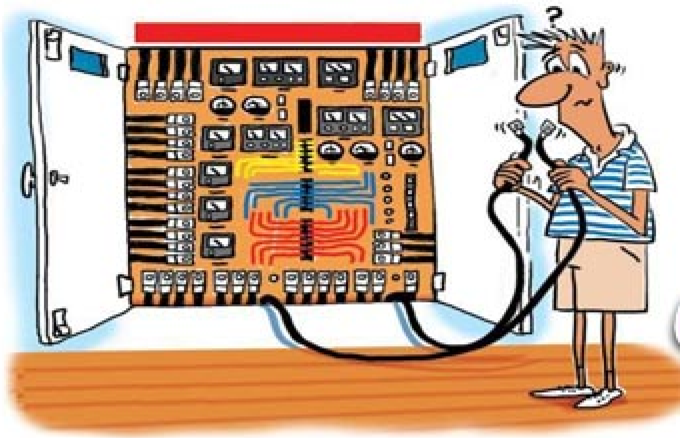

نعیم طارق

جینوئن سپئر پارٹس

یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم سرمنڈائیں اور اولے نہ پڑیں، چنانچہ عین جس دن ہمارا میٹرک کا امتحان ختم ہوا، اسی شام کرم الٰہی المعرف حوالدار کرمی فوج سے پنشن لے کر بمعہ 15 عدد ٹرنک گاؤں کے چوک پر ٹرک سے نیچے اترے۔ رات ہونے تک اہل خانہ و اہل علاقہ کو یہ عظیم خوشخبری مل چکی تھی کہ اب آپ کو اپنے ریڈیو، گراموفون اور ٹیپ ریکارڈ جیسے قیمتی الیکٹرونک آلات کی مرمت کے لیے دور دراز کے بڑے شہروں تک دھکے کھانے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ اسی کام کے لیا استاد کرمی صاحب گلی کے نکڑ پر پبلک الیکٹرک و الیکٹرونکس ریپئر سنٹر کے نام سے عوامی خدمت کے جذبے سے سرشار دکان کھولنے والے ہیں۔ اگلے دن بابو برف والے کے پھٹے پر بیٹھ کر ابا جان اور استاد کرمی کی طویل ملاقات میں یہ طے پایا کہ ہمیں امتحان سے فارغ خیال کرتے ہوئے ایک دوسرے امتحان میں ڈالنے کے لیے ان کے ساتھ دکان پر لگا دیا جائے۔

سفر کے بعد بھی میں اک نئے سفر میں رہا

خیر وہ دن بھی آ پہنچا جس کا سب کو بڑی بے چینی سے انتظار تھا۔ بسیار خرابی کے بعد بالاخر گاؤں میں الیکٹریشن کی پہلی دکان کھل گئی۔ بطور الیکٹرکل ٹیکنیشن استاد کرمی ملازمت کے دوران جن آلات کو ناکارہ قرار دلوا کر اپنے ٹرنکوں میں بھر کے ساتھ لائے تھے۔ ان کل پرزوں کا ایک کباڑ عظیم کو دکان کے طول عرض میں پھیلا دیا گیا تا کہ لوگوں کو استاد کرمی کے ماہر کاریگر اور کہنہ مشق ہونے کا اندازہ ہوسکے۔ محلے بھر میں لڑکوں کی ایک ٹولی کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ جس گھر میں بجلی سے چلنے والی جو چیز بھی خراب حالت میں پڑی ہے اسے فوری طور پر دکان پر پہنچایا جائے۔ چنانچہ جس طرح محلے کے خالی پلاٹ میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے دکان انواع و اقسام کی چیزوں سے بھرنا شروع ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام تک خود استاد کرمی کو اندر بیٹھنے کی جگہ نہ ملنے پر دکان کے آگے ایک لکڑی کا بینچ ڈال کر پہلی توسیع کرنا پڑی۔ اس انتہائی مصروف دن کا اختتام دکان کی خیر و برکت کے لیے بچوں کے جم غفیر میں شرینی تقسیم کر کے بھر پور ہوا۔ اس سعادت کے لیے گاؤں کے امام مسجد کو بلوایا گیا جو جاتے ہوئے مرمت کے لیے اپنی سیکو فائیو گھڑی استاد کرمی کے ہاتھ پر باندھ گئے۔

اگلے دن آلات کی مرمت کا باقاعدہ آغاز ماسٹر اسحاق کی ٹیپ رکارڈ سے ہوا۔ آدھ گھنٹہ کی مغزماری پر جب بات استاد کرمی کے وائے سے باہر ہوگئی تو بندہ بھیج کر سکول سے ماسٹر جی کو بطور خاص بلوایا گیا تا کہ تحقیق و تشخیص کے عمل کو سائنسی بنیادوں پر آگے بڑھایا جاسکے۔ بطور چشم دید گواہ ماسٹر جی نے بتایا کہ آخری مرتبہ ان کی ٹیپ ریکارڈ سے نوٹوں کی گڈی باندھنے والے ربڑ بینڈ کی مانند کوئی چیز باہر نکلی تھی۔ نقص کیا ملنا تھا، استاد کرمی کی باچھیں کھل گئیں، ماسٹر جی کو نہایت ادب و احترام سے رخصت کر کے ہمیں سامان کے ڈھیر سے ربڑ بینڈ ڈھونڈنے پر لگا دیا اور خود ربڑ بینڈ چڑھانے کی پلی کی تلاش میں ٹیپ ریکارڈ پر جھک گئے۔ دو گھنٹوں کی ریاضت کے بعد ہم دو عدد بیلٹ دریافت کر چکے تھے ایک چھوٹا ور ایک بڑا۔ بڑا بیلٹ ڈھیلا تھا چلنے پر ٹیپ سے عجیب قسم کی آوزایں سنائی دینے لگیں چنانچہ ریورس اور پلے بٹن کے درمیاں کاغذ کا ایک چار تہہ کیا گیا ٹکڑا اس مہارت سے ایڈجسٹ کیا گیا کہ

موٹر کی سپیڈ متوازن ہو گئی لیکن جلد ہی یہ بیلٹ بھی ٹوٹ گیا۔ اس لیے تمام تر ذمہ داری چھوٹے بیلٹ پر آن پڑی، چھوٹا بیلٹ اتنا ٹائٹ تھا کہ اب اسی کاغذ کے ٹکڑے کو فارورڈ اور پلے بٹن کے مابین ایڈجسٹ کرنا پڑا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ مرمت کے اخراجات کا گوشوارہ بنانے کا مرحلہ آیا تو سروس چارجز ڈالنے پر بھی 60 روپے سے اوپر بل نہ بنتا تھا۔ بجلی کے بلوں میں لگنے والے فیول ایڈجسٹمنٹ کے اصول پر ٹیپ کی باڈی میں چار نئے پیچ لگا کر استاد کرملی بل کو 300 تک کھینچ لایا۔ چھٹی کی گھنٹی بجنے سے پہلے سکول میں یہ دھوم مچ گئی کہ ماسٹر اسحاق کی ٹیپ استاد کرملی نے ریڈی کردی ہے، ماسٹر جی حیرانگی اور مسرت کے جس ملے جلے احساس کے ساتھ دکان پر آئے وہ بل دیکھتے ہی غم اور اندوہ کے احساس میں بدل گئی۔ خیر پیسے ادا کر کے ٹیپ ریکارڈ لے گئے، شام کو ہانپتے کانپتے پھر وارد ہوئے اور کہنے لگے یار کرملی گانوں کی سمجھ نہیں آرہی۔ بہت سادہ اور مختصر انداز میں استاد کرملی نے جواب دیا کہ ماسٹر جی آپ پہلے کسی اور ٹیپ رکارڈ پر انہی گانوں کو سن کر ان کے بول ذہن نشین کرلیں گے تو آسانی رہے گی۔

باقی آلات کی مرمت کی کہانی زیادہ حوصلہ افزا رہی۔ جن آلات میں معمولی اور سمجھ میں آنے والے نقائص تھے انہیں ٹھیک کر کے زمانی ترتیب سے رکھ دیا گیا۔ لڑکے چونکہ بلا سوچے سمجھے لوگوں کے گھروں سے سامان اٹھا لائے تھے اس لیے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ 'What is what & who is who'

لہذا پہلے آئیے پہلے پائیے کے اصول پر ترتیب یوں بنی کہ جو کوئی اپنا سامان کا پتہ کرنے پہلے دکان پر آپہنچا اسے مرمت شدہ مال میں سے فوری طور ضرورت کی چیز مہیا کردی گئی۔ اس کے کئی فوائد سامنے آئے کہ ایک تو دکان میں جگہ خالی ہونا شروع ہو گئی، آمدن میں اضافہ ہوا اور لوگوں کا استاد کرملی کی مہارت پر اعتبار جمنا شروع ہو گیا۔ دوسری طرف اس سٹاک ایکسچینج سے صورت حال یہ بنی کہ خالہ حمیداں کی استری جنجوعہ صاحب کے گھر استعمال ہو رہی تھی تو بشیر چڑا اسی کے گھر علم الدین کا ٹی وی چل رہا تھا۔ چند ہی روز میں اس کے مضمرات بھی سامنے آنا شروع ہو گئے۔ گھریلو لڑائی جھگڑوں نے محلوں سے نکل کر استاد کرملی کی دکان کا رخ کر لیا۔ ہر کوئی اپنے سامان کے بابت دریافت کرنے لگا کہ کس کے گھر ہے؟ گواہان کی موجودگی میں تقریبات حلف برداری منعقد ہونا شروع ہو گئیں کہ فلاں چیز ہماری ہے، فلاں آپ کی۔ بات قسموں و قرآن تک جا پہنچی تو استاد کرملی نے دیگر ملکی مسائل کی طرح انہیں بھی مقامی سطح پر حل ہونے کے لیے چھوڑ دیا اور خود چند روز کے لیے تبدیلی آب و ہوا کے بہانے پنشن لینے پنڈی چلے گئے۔

کرملی نے پنڈی سے واپسی پر طریقہ واردات کو یک لخت تبدیل کر دیا۔ گاہک سے جینوئن سپیئر پارٹس کے نام پر ایڈوانس کے طور پر ایک خطیر رقم لے لی جاتی۔ مجھے منہ اندھیرے خراب شدہ آلات کے تھیلے کے ساتھ ملتان روانہ کر دیا جاتا۔ میں سارا دن مختلف دکانوں سے آلات مرمت وغیرہ کروا کر چپکے سے آکر دکان میں رکھ دیتا۔ ہر سائز کے چمکیلے نئے پیچوں کا ڈبہ میز پڑا پر رکھا ہوتا۔ گاہک کے آنے پر استاد کرملی اس کے لیے ایک کڑک دار چائے کا آڈر دیتا اور پہلے سے ٹھیک شدہ آلے کو خواہ مخواہ کھول کر باڈی میں نئے جاپانی پیچ لگا کر بند کر کے چلا کر چیک کروا دیتا، رفتہ رفتہ دکانداری چمکنے لگی۔ لیکن لوگ خرچہ زیادہ ہونے کا گلہ کرنے لگے۔

جب مرمت پر اٹھنے والے اخراجات کی شکایات عام ہو گئیں تو استاد کرملی نے ایک بار پھر خود قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ اس مرتبہ نشانہ ڈاکٹر سلیم کا ٹی وی بنا۔ نقص تلاش کرنے کی باری آئی تو میٹر کی جگہ ٹیسٹ بتی کو استعمال میں لایا گیا۔ مختلف واٹ کے 3 چار بلب باری باری کام میں لائے گئے، شومئی قسمت 200 واٹ کے بلب کو سیریز میں لگانے پر ٹی وی چل پڑا۔ لیکن یونہی بلب بند کر دیا جاتا تو ٹی وی بھی بند ہو جاتا۔ لہذا یہی حل سوچا گیا کہ بلب کو ٹی وی کے اندر ہی لگا رہنے دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب ٹی وی اٹھانے آئے تو استاد کرملی انہیں نہایت رازدانہ انداز میں ایک طرف لے جا کر بولا کہ ڈاکٹر صاحب آپ کا ٹی وی چلنے والا نہیں تھا جب

تک جینوئن سپیئر پارٹس نہیں مل جاتے آپ 200 واٹ کا بلب اندر ہی لگا رہنے دیں، بس رات کو ٹی وی کو صحن میں رکھ کر چلا لیا کریں اور صحن کی باقی لائٹس آف رکھیں اس طرح روشنی بھی ہوجائے گی۔اور تو اور بچے بھی ٹی وی کے پیچھے بیٹھ کر بلب کی روشنی میں ہوم ورک کرلیا کریں گے۔اس سے ایک تو ان کی ٹی وی دیکھنے کی عادت چھوٹ جائے گی دوسرا آپ کو اضافی بل بھی نہیں آئے گا۔

آہستہ آہستہ نئی قسم کے ٹی وی اور وی سی آر کی مرمت زیادہ وقت طلب ہوگئی تو استاد کرملی کے لیے اتنے سارے جوڑ اور ٹانکے یاد رکھنے مشکل ہوگئے۔جو تار یا ٹانکہ کھولتے کاغذ کے پرزے پر نمبر لکھ کر ٹیپ سے اسی تار پر چپکا دیتے کہ یاد رہے کہاں سے کھولی تھی۔ایک ایک ٹی وی میں ایسی تاروں کی تعداد بعض اوقات 200 سے بھی زائد ہو جایا کرتی۔ایک رات چوہوں کی یورش ہوئی تو سب خلط ملط ہوگیا تمام تاروں کے کاغذ کے پرزے غائب۔اس کا اثر یوں سامنے آیا کہ جن آلات کو استاد کرملی کھول چکے تھے انہیں دوبارہ بند کرنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔یوں کھلے ڈھانچوں کا ایک انبوہ کثیر اکٹھا ہوگیا، جن میں جا بجا چڑیوں نے گھونسلے بنانے اور چوہوں نے اودھم مچانے شروع کردیے۔شروع شروع میں لوگوں نے دکان کے چکر لگائے پھر جب نئے ماڈل بازار میں آگئے تو انہوں نے استاد کرملی کی دکان پر پڑے ہووں پر صبر و شکر کرلیا۔

دوسری طرف استاد کرملی کساد بازاری سے تنگ آکر اگر کسی شے کی مرمت ملتان سے کروا بھی لیتا تو لینے کوئی نہ آتا، چنانچہ دکان کیا ہر اس قسم کے دھمکی آمیز دیواری بورڈز کا اضافہ دیکھنے میں آنے لگا۔"ورکشاپ کے اندر آنا یا کسی چیز کو ہاتھ لگانا سخت منع ہے"، "دوران مرمت کسی آلے کے ڈیڈ ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں" "مشورہ فیس اور سروس چارجز الگ ہوں گے"۔"سیاسی گفتگو اور فرش پر تھوکنے سے پرہیز فرمائیں"، "گاھک اپنا سامان 10 یوم کے اندر اٹھا لیے بعد میں دکاندار ذمہ دار نہ ہوگا"۔۔۔۔۔بعد میں مدت معیاد میں توسیع کرتے ہوئے پہلے 20 اور پھر 30 یوم تک کا اعلان بھی کیا گیا مگر جنہوں نے نہیں آنا تھا نہیں آئے۔قصہ مختصر ہمارے میٹرک کا رزلٹ آنے سے پہلے استاد کرملی صاحب دکان کا کاٹھ کباڑ اونے پونے بیچ کر بینک گارڈ کی نوکری اختیار کر چکے تھے۔

بڑی مدت کے بعد کل رات میں نے استاد کرملی کو ایک رکشے والے سے چوک میں لڑائی کرتے دیکھا تو قریب پہنچ کر معاملہ دریافت کیا، استاد جی بڑے غصے میں بولے یار دنیا سے اخلاق اور پیار ہی اٹھ گیا ہے میں نے کتنے ہی لوگوں اور دکانداروں سے پوچھ چکا ہوں کہ وہ سامنے والا ٹاور کس موبائل فون کمپنی کا ہے کوئی بتاتا ہی نہیں، یہ رکشے والا بھی وہاں تک جانے کے پچاس روپے مانگ رہا ہے، غضب خدا کا، ایک کال کرنی ہے اور جان پر بنی پڑی ہے، میں کہا کال وہاں جا کر کیوں کرنی ہے ، کہنے لگے یہ موبائل لیا تھا خراب ہوگیا تو میں نے مرمت کی، اب چلتا تو ہے لیکن کال ٹارو کے نیچے جا کر کرنی پڑتی ہے ورنہ سگنل نہیں اٹھاتا، میں نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے عرض کیا کہ استاد محترم آپ کال میرے موبائل سے کرلیں اور اپنے والا موبائل مجھے دے دیں میں ملتان سے جا کر اس میں جینوئن سپیئر پارٹس ڈلوا لاوں گا۔جینوئن سپیئر پارٹس کے نام پر وہ بخوشی راضی ہوگئے۔میں جب اگلے دن ملتان جا کر اس موبائل کو ٹھیک کروانے موبائل شاپ پر پہنچا تو دکاندار نے نہایت رازداری سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے میرے کان میں کہا" حضرت اس موبائل فون کو بنانے والی کمپنی آج کل کھادیں اور زرعی آلات بناتی ہے اور آپ اس کے جینوئن سپیئر پارٹس تلاش کر رہے ہیں"

کافی

تھوڑی دیر کے لیے یہ مان لیتا ہوں کہ کافی میں سے واقعی بھینی بھینی خوشبو آتی ہے۔مگر یہ کہاں کی منطق ہے کہ جو چیز ناک کو پسند ہو وہ حلق میں انڈیل لی جائے۔اگر ایسا ہی ہے تو کافی کا عطر کیوں نہ کشید کیا جائے تاکہ ادبی محفلوں میں ایک دوسرے کے لگایا کریں۔ کافی از مشتاق احمد یوسفی

محمد عاطف مرزا

فسانۂ بے عروضی

اُسے بچپن ہی سے شعر گھڑنے کا شوق تھا۔ پرانے کاریگر شاعروں کے شعر دیکھ دیکھ کر اُس نے کافی سارے شعر گھڑنے سیکھ لیے تھے۔ اُس کے بابا جان بھی کسی زمانے میں شعر گھڑتے تھے اور اپنے ہی انداز کے شعری کاریگر رہے، بعد میں انھوں نے توبہ کرلی۔ بابا کی توبہ سے بھی اُس نے کوئی اثر نہ لیا اور شعر گھڑنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہ شعروں کی پیمائش بالشتوں سے کیا کرتا، خیال کے سوچیلے سادہ باٹوں سے اوزان پورے کرکے، انھیں چاہت کی چھلنی سے چھان کر خونِ دل کی پالش مار دیا کرتا تھا۔ ایسے اکثر درست پیمائش اور اوزان کے شعر گھڑے جاتے تھے۔ کبھی دوسرے کاریگر اُس کے بالشتی شعروں کی تعریف بھی کردیا کرتے۔ کچھ اپنے مسطروں اور عروضی باٹوں کے مستند ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے اُس کے بالشتی پیمائشی فارمولے، سوچیلے اوزان اور چاہت کی چھلنی کو ناکارہ بھی قرار دیا کرتے تھے۔ وہ تو صرف اپنے دل کی بات سن کر عام لوگوں کے لیے سچے سچے شعر گھڑنے کا خواہاں تھا، مگر اُس کے شعروں کو پذیرائی نہ ملی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُس نے بھی تقطیع کرنے والی فیکٹری میں نوکری کرلی، وہاں مستند مسطروں، عروضی باٹوں اور لغات کی چھلنی کی مدد سے شعر گھڑے جاتے تھے، مگر وہ مصر تھا کہ وہ اپنے بابا کے فارمولوں اور پرانے انداز سے جو دل کرے گا گھڑے گا۔ اُس کی اس حرکت پر فیکٹری کے مالک بہت ناراض ہوئے اور اسی جرم میں اُسے فیکٹری کی نوکری سے نکال دیا گیا۔

وہ ایک عرصے سے لوگوں کے بیچ میں رہتا آیا تھا۔ اُسے خواب، سراب، حقیقت، خیال، گمان، واہمے، نظریے، محنت، لگن، سعی، کوشش، عمل، ممکن، حاضر، غائب کے بہت سے اوزار دستیاب ہوگئے، دل پہلے ہی آمادہ تھا۔ اُس نے درج بالا عناصر سے کہانیاں کشید کر کے لفظوں کی شکل دی، بالشتوں سے ناپا، سوچیلے اوزان سے تولا اور میل کچیل نکالنے کے لیے چاہت کی چھلنی سے چھان کر اچھی طرح رت جگوں کے لہو اور غم گزیدہ آنسوؤں میں گوندھا اور اوراق پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا۔ آنسو خشک ہونے پر لہو کے رنگ نے لفظوں میں ایک عجیب سا نکھار پیدا کردیا۔ یاروں دوستوں، دل اور علم والوں نے اُس کے شعروں کو بہت سراہنا شروع کردیا۔

اُس کے شعرا کثر بڑی شعری فیکٹریوں کے مالکان کو بہت پسند آتے ہیں۔ کئی بار اُسے اِن فیکٹریوں کی جانب سے جنرل منیجر وغیرہ ٹائپ کی پوسٹ آفر ہو چکی ہیں مگر اب اُس کی چھوٹی سی ذاتی صنعت کافی فروغ پا چکی ہے۔ اُس کے حلقۂ احباب میں شامل کئی بڑی فیکٹریوں کے مالکان نے خود بھی شعر گھڑنے کا آغاز اسی فارمولے سے کیا تھا، اسی وجہ سے وہ ایسے تمام لوگوں کا کافی ادب کرتا ہے۔ وہ سب بھی اُسے بہت زیادہ سراہتے ہیں۔ وہ

انہیں ان کی فیکٹریوں کے سبب نہیں بلکہ ان کے سچے انداز کی وجہ سے بڑا مانتا ہے۔ وہ لوگ کبھی کبھی اُس سے آسانی سے شعر گھڑنے کے گر بھی سکھا دیتے ہیں۔ ان کی یہ شفقت بہت سے لوگوں کو بری لگتی ہے اور کافی سارے نام نہاد مستند شعری کاریگر اُس کی بالشت بھر کی، سوچیلی اور چھنی ہوئی شاعری سے جلتے جلتے کالا شاہ کا کو بن چکے ہیں۔ حاسدانہ روایات کی پاسداری کرتے ہوئے ان کاریگروں نے کئی بار انہیں ایک دوسرے سے متنفر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی، مگر بڑی فیکٹری کے مالکان کے دل بھی بڑے ہوتے ہیں، شفقت اور سعادت مندی نے مل کر اکثر یہ سازشیں ناکام بھی بنائی ہیں۔

اُس کی محنت سے متاثر ہو کر کئی بڑے ماہرینِ شعرا سے کچھ مستند مسطروں، عروضی باٹوں اور فرہنگی چھلنیوں کے مہنگے سیٹ تحفے میں دیتے ہیں۔ جنہیں وہ یادیں تازہ رکھنے کے لیے بطور تبرک کبھی کبھی استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر اُس کے سادہ سے ہنر کی تسلی نہیں ہوتی اور وہ اپنی بالشتی پیمائشوں پر چل پڑتا ہے۔

اُس کی شاعری کے شوروم میں رکھی گئی کچھ غزلیں، نظمیں دل والے گاہکوں کو بہت پسند آتی ہیں۔ دوسری تقطیعی فیکٹریوں کے مالک بھی اب اُس کے ہنر کو تسلیم کر کے اُس کے دوست بن چکے ہیں، کبھی کبھی وہ اپنے مستند مسطروں اور عروضی باٹوں سے اُس کی بالشتی شاعری کی پیمائش کرتے ہیں تو "عش عش" کر اُٹھتے ہیں۔ اُس کی بالشتی شاعری کبھی ان کے مسطروں سے ایک آدھ سوتر باہر یا عروضیانہ اوزان سے ایک آدھ تولہ کم یا زیادہ ہو جائے تو وہ معذرت کر کے اُسے واپس گودام میں رکھ دیتا ہے اور فرصت کے لمحات میں جذبہ نامی پوٹین، فرہنگی ریگ مال اور لفظی پالش مار کر دوبارہ شوروم میں لے آتا ہے۔ اکثر اوقات کسی شعری نمائش میں اُس کی بالشتی شاعری، مستند مسطروں اور عروضی اوزان کی مدد سے گھڑی گئی شاعری سے زیادہ شنوائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

وہ ہمیشہ ربِ علم و ادراک کا شکر ادا کرتا ہے کہ عروضی تقطیعی فیکٹری کی غلامانہ نوکری سے پاک رکھ کر اپنی آزادانہ شعری صنعت چلانے کی ہمت عطا کی۔ گو اُس کی شاعری کی زیادہ مانگ نہیں مگر بہت سے اردو ئی مقامات تک مشہوری ضرور ہے۔

عثمانی بلوچ

کہانی ایک بیروزگار کی

اُس کا اصل نام تو اُسے خود بھی یاد نہیں تھا، جب اُس نے عقل و شعور سے بند اپنی آنکھ کھولی تو خود کو سانڈے سانڈے کہتے سنا۔۔۔تو اس مسئلے کا حل اس نے کارڈ چھپوا کر کیا کیونکہ جس تقریب میں اسے جانا ہوتا تھا، وہ اصل نام بھول جاتا تھا۔اس کے لیے کارڈ نکال کر وہ بتاتا تھا کہ اُس کا اصل نام کیا ہے۔

اُس کے متعلق ماں باپ میں مشہور تھا کہ وہ ایک اچھا لڑکا ہے کیونکہ پیدائش کے وقت اُس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اس کے متعلق محلے داروں میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہ مجذوب ہے اللہ والا ہے مکار ہے عیار ہے۔ جو لوگ اسے اللہ والے سمجھتے تھے وہ اس لیے کہ وہ چوبیس گھنٹے نشہ میں دھت ہوتا تھا، محلے دار سمجھتے تھے کہ شاید وہ فنا فی اللہ ہو چکا ہے۔ جو اُسے مجذوب سمجھتے تھے وہ اُس لیے کہ وہ چوریاں کرتا تھا۔۔۔جو مکار سمجھتے تھے وہ اس لیے کہ وہ نیم وا آنکھوں سے لڑکیوں کو دیکھتا رہتا تھا۔

اُس نے باپ کا نام میٹرک میں فیل ہو کر روشن کیا کیونکہ وہ محلے کا واحد آدمی تھا جو میٹرک میں فیل ہوا تھا۔ جب باپ نے عزمِ صمیم کر کے اسے پڑھانے کا فیصلہ کیا تو اس نے میٹرک میں ہیٹرک کر کے باپ کا سر شرم سے اونچا کر دیا۔

میٹرک میں فیل ہو کر اس نے ہمت نہ ہاری بلکہ گلی محلے کی حسین لڑکیوں کو پاکیزہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا اور اُنہیں ایزی لوڈ کروا کروا کر اُس پر انکشاف کرتا رہتا تھا کہ اُس کی زندگی میں اس کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

میٹرک میں فیل ہو کر کالج کی دیواروں کا طواف شروع کر دیا شاید وہاں شنوائی ہو مگر گرلز کالج کے سامنے لڑکیوں کے والدین کیسے برداشت کرتے۔ ایک لڑکی کے والد نے تو اسے کچلنے کی سعی بھی کر ڈالی، لیکن یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ گٹر کا ہول کھلا ہوا تھا، اُس میں گر اپنی عزت کا فالودہ نکلوا کر اپنی جان بچائی لیکن اس کا ایک فائدہ ہوا کہ اس لڑکی اسے بھائی بنالیا۔

اُسے اس بات سے چڑ تھی کہ کوئی حسین و جمیل لڑکی اسے بھائی بنائے، اس نے کہا کہ ملک کے اندر ایک ہٹے کٹے باڈی بلڈر الطاف بھائی کیا کم ہیں کہ لڑکیاں اُس جیسے ہر دوسرے معصوم پرہیزگار نوجوان کو بھائی بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔

اُس نے فوج میں بھرتی ہونے کی کوشش کی مگر نقارہ خانے میں طوطی کی کون سنتا، اس نے پریشان ہو کر سوچا کہ کیا کیا جائے حالانکہ سوچتے تو صرف دماغ والے ہیں مگر پھر بھی اس نے باتھ روم کے اندر جا کر سوچا تو کوئی ترکیب نہ بنی تو اس نے روڈ پر آ کر سوچا، اُسے ایک رکشے والا ملا جس کے پیچھے لکھا ہوا تھا'' ہم کچھ نہیں لکھتے'' ایک اور رکشہ گزرا جس پر ایک حسین اور جمیل لڑکی کی تصویر تھی جس کے پیچھے ایک لڑکا منہ بولی بہن کو چھوڑنے جا رہا تھا اور اس کی نگاہوں اس منہ بولی بہن کی باتوں سے زیادہ اس اشتہار

پر مرکوز تھیں ۔کئی اور دوکاندار بھی بیویوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کیونکہ سب بیچارے کوئی وزیر تو نہیں تھے انہیں روبرو بیٹھا کر دیکھتے یا دوست محمد کھوسہ کی طرح اسے اپنے گھر بلاتے یا وزیرِ اعلیٰ تو نہیں تھے کہ انہیں دعوت دیتے (براہِ راست نکاح کی) وہ اور بھی بہت کچھ دیکھ لیتے اگر ان کے پاس دستی کا نمبر ہوتا۔

پھر اُس کے خالی ذہن میں ایک خیال دھم سے کودا، اضطراب سے گھبرا کر اس نے سوچا کہ کیوں نہ یہاں سے اپنی جان چھڑائی جائے اور شاعر بن کر عالمی شہرت کمائی جائے۔اُس کا خیال یقیناً پایۂ تکمیل تک پہنچتا اگر اُسے منشیات کے کیس میں جیل کے اندر نہ بھیج دیا گیا ہوتا۔

وہاں تو صرف تھانیدار اور سپاہیوں کی شاعری سُننی پڑتی ہے. کسی کی کیا مجال کہ وہاں جا کر وہ اپنی شاعری سنائے ۔تھانیدار کے تخلیق کردہ عروض کو مدنظر رکھ کر تمام سپاہی اپنی غزلیں بے دھڑک سناتے ہیں اور سامعین سے داد وصول کرتے ہیں اور جیل میں شاعری کا سر چکرا جاتا ہے کہ وہ کس اذیت میں مبتلا ہوگئی ہے

اُسے کس نے رہا کروایا، اُسے خود بھی پتہ نہیں تھا. صرف اتنا اسے پتہ چلا کہ تھانیدار نے دو کلو چرس کا نذرانہ لے کر رات کے اجالے میں رہا کر دیا۔اُس نے سوچا کہ کیوں نہ سیاستدان بنا جائے ، سائیکل مارچ کروں یا ایک پارٹی بنا کر ملک وملت کی خدمت کروں اور اپنے لیے ایک مناسب سا رشتہ تلاش کروں۔ اُس نے جب اپنی باتوں کا تذکرہ بھولے خان عرف بھانڈے خان سے کیا تو اس نے حامی بھی لی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ ملک کے اندر اُس نئی پارٹی کا مرکزی دفتر کراچی میں نائن زیرو کے ساتھ ہو۔ یہ مضحکہ خیز شرط اُسے سمجھ نہ آئی۔ بہر حال اُس نے اپنا آفس وہاں بنایا اور کارکنوں کو لڑوایا خود اسلام آباد میں رہائش گاہ بنا کر پناہ حاصل کر لی۔۔۔آجکل سنا ہے کہ سانڈے میاں کی مقبولیت کا گراف اتنا بلند ہے کہ انہیں اپنا نام اخبار میں تلاش کرنے کے لئے عینک کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔اب تو ان کا طوطی بولتا ہے صرف وہ ایک طوطی بولتی ہے جو انہوں نے اپنے بڑے غریب جھونپڑے میں پالی ہوئی ہے۔

سانڈے میاں کی صلاحیتوں سے ہم بھی متاثر ہیں لیکن ہمیں ڈر اس بات کا ہے کہ جو بل اسمبلی سے سائبر کرائم کا پاس ہوا ہے وہ ہم پر لاگو نہ ہو جائے، اُس لیے سانڈے میاں سے خوفزدہ تیل کی قیمتوں سے افسردہ ہو کر ہم نے ایک گدھا پالا ہوا ہے جو سانڈے میاں کو گفٹ کرنے جانا ہے،بس دعا کرو کہ یہ دن جلدی آئے۔

ایک تھی چڑیا ایک تھا چڑا، چڑیا لائی دال کا دانا، چڑا لایا چاول کا دانا۔اس سے کھچڑی پکائی۔دونوں نے پیٹ بھر کے کھائی۔آپس میں اتفاق ہو تو ایک ایک دانے کی کھچڑی بھی بہت ہو جاتی ہے۔

چڑا بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ اُس کے دل میں وسوسہ آیا کہ چاول کا دانا بڑا ہوتا ہے، دال کا دانا چھوٹا ہوتا ہے۔پس دوسرے روز کھچڑی پکی تو چڑے نے کہا اس میں چھپن حصے مجھے دے، چوالیس حصے تُو لے۔اے بھاگوان پسند کر یا ناپسند کر، حقائق سے آنکھیں مت بند کر! چڑے نے اپنی چونچ میں سے چند نقاط بھی نکالے اور اُس نے بی بی کے آگے ڈالے۔بی بی حیران ہوئی بلکہ رو رو کر ہلکان ہوئی کہ اُس کے ساتھ تو میرا جنم کا ساتھ تھا لیکن کیا کر سکتی تھی۔

دوسرے دن پھر چڑیا دال کا دانا لائی اور چڑا چاول کا دانا لایا۔دونوں نے الگ الگ ہنڈیا چڑھائی، کھچڑی پکائی۔کیا دیکھتے ہیں کہ دو ہی دانے ہیں۔چڑے نے چاول کا دانا کھایا، چڑیا نے دال کا دانا اُٹھایا۔چڑے کو خالی چاول سے پیچس ہوگئی، چڑیا کو خالی دال سے قبض ہوگئی۔دونوں ایک حکیم کے پاس گئے جو ایک بلا تھا۔اُس نے دونوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرا اور پھیرتا ہی چلا گیا:

دیکھا تو تھے دو مشت پر

یہ کہانی بہت پرانے زمانے کی ہے۔آج کل تو چاول ایکسپورٹ ہو جاتا ہے اور دال مہنگی ہے، اتنی کہ وہ لڑکیاں جو مولوی اسمٰعیل میرٹھی کے زمانے میں دال بگھارا کرتی تھیں، آج کل فقط شیخی بگھارتی ہیں۔

اُردو کی آخری کتاب از ابنِ انشاء

ذہین احمق آبادی

عالمِ رویا میں

سہ ماہی برقی مُجلّہ ''ارمغانِ اِبتسام'' کے مدیر کا 'برقی خط موصول ہوا کہ آپ سے قلمی تعاون کی درخواست ہے۔۔۔جس کو بہر حال ''دستی تعاون'' کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔۔۔! کیا لکھوں۔۔۔ بہت سوچ بچار کی مگر کچھ پلّے ہی نہ پڑا کہ کیا کیجئے۔۔۔!

ویسے میں مدیر صاحب کا اتنا احترام کرنے پر مجبور ہوں... ورنہ یہ تحریر شاید ہی چھپے۔۔۔ماضی میں کسی کی چھاپنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔۔۔باقیوں کے 'معیار' پر میں پُورا نہیں اُترتا تھا اِس لئے میں نے فیس بُک پر ہی طبع آزمائی شروع کی جہاں 'دِیوار' اور 'معیار' دونوں اپنے۔۔۔اِنھوں نے جو چھاپا تو 'ذہین احمق پُوری' لکھ دیا فہرست میں۔۔۔ مزہ آگیا۔۔۔ میرے ساتھ ہاتھ ہوگیا... یہ غالبًا احمق آباد کا وہ ضلع ہوگا جہاں میں رہتا ہوںگا۔۔۔ ویسے اسے دیکھ کر میں سر پیٹ کر رہ گیا کہ توبہ ٹُوٹی بھی تو ٹوٹے ہوئے پیمانے سے۔۔۔ جیسے ایک دفعہ ایک محترمہ نے پچھلی کھڑکی سے کچھ برقی خطوط پھینکے۔۔۔اور وہ بھی پتھر میں باندھ کر... آگے لگے بھی وہ اس نامعقول کھوپڑیا پر۔۔۔ بس پھر کیا تھا، حماقتوں کا اخراج اس میں سے ایسا ہوا گویا یہ سویلس بینک رہی ہو... ان کا برقی خط کھولا تو جھٹکا ہی لگا... لکھا تھا۔۔۔''یہ بات خیال میں رہے کہ مابدولت احمقستان کی ملکہ عالیہ ہونے کا شرف رکھتی ہیں''۔۔۔اور میں نے حیران و پریشان اور کچھ کچھ خوش ہوکر کہہ دیا کہ بالکل رکھیں مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔۔۔ غالبًا 'خوش فہمی' کا شکار ہیں آپ۔۔۔لیکن پھر جلد ہی انھوں نے اس بات کی تصریح کردی کہ ''احمق آباد اور احمقستان میں وہی فرق ہے جو کُرتہ اور شیروانی میں ہے''۔۔۔!میں نے احمقستان کا حدودِ اربعہ معلوم کرنے کی ہر چند کوشش کی مگر ان کا جواب تھا 'یہاں حدود خان موجود ہیں نہ ہی اربعہ بی بی کا وجو۔۔۔!میری ساری 'خوشی' پر حماقت پھر گئی۔۔۔!

ہمارا گھر چونکہ ایک پہاڑی پر واقع ہے اور گھر کے پیچھے بے آب و گیاہ پہاڑی ہی تا حدِ نگاہ پھیلی ہوئی ہے۔۔۔اس لئے میں صبح گاہی ورزش کرنے واسطے اونچائی تلک دوڑ لگاتا ہوں، پتھریلے علاقے میں بھاگتے ہوئے مزہ بھی آتا ہے اور دشوار گزار راستوں پر بھاگنے کا سلیقہ اور قدم جمانا بھی آجاتا ہے اور پہاڑی سے نیچے آؤ تو وہاں انتخابات کے باعث ایک نئی نویلی دلہن کی مانند سڑک بھی بچھ چکی ہے تاکہ سندر ہے اور بوقتِ انتخابات کام آوے جس کا مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے بعد ہی ہتھے سے نئی دلہن کی مانند ہی اکھڑ جائے گی تاکہ اگلے انتخابات میں دوبارہ امیدوار کو مستند کرنے کے کام آوے۔۔۔ خیر۔۔۔تو وہاں میں ہر روز بھاگتا ہانپتا جاتا تھا اور ایک سر سبز قطعے پر سر کے بل کھڑا ہوتا جو حماقت مآبی

کیلئے اکسیر کی مانند ہے اور خوب اچھل کود کرتا تھا۔ ہر روز کی ایک ہی جگہ مخصوص تھی، میری اونچائی جتنی "ڈھیری" پر ہی ایک ہٹا کٹا بھورے رنگ کا کتا مجھ سے کچھ دور محوِ استراحت ہوتا تھا اور میرے آنے پر بقولِ پطرس "غزل گوئی" شروع کر دیتا تھا۔ اس نے شاید عمر خیام سے بھی زیادہ بحریں مجھے سنائی تھیں یا شاید آزاد غزل سناتا تھا، میرے اور اس کے بیچ ایک نشیب حائل تھا۔۔۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اپنے کام میں مگن رہتا اور وہ اپنے "کام" میں اور اسی طرح کا طرزِ عمل ہمیں "اصل" میں بھی "بھونکنے والی مخلوق" سے رکھنا چاہئے۔۔۔ ایک دن میرے صبر کا گلاس لڑھک گیا اور میں نے بھی اسکی طرف منہ کر کے بھونک دیا اور اپنی "حد" پار کر گیا۔۔۔ پھر اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کے اس کو شعر سے گلہ ہوا تھا یا بحر سے، یا میرے "غزل" کے "پڑھنے" کا انداز ناگوار گزرا تھا۔۔۔ یا شاید "زمین" ہی غیر مسطح تھی، میں نے اس کی تحقیق کرنا غیر سودمند جانا۔ میں نے تو "شعر" مقطع سمجھ کر "عرض" کیا تھا اور اس میں "تخلص" بھی استعمال کیا تھا مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کے ہاں "حسنِ مطلع" کی طرح "حسنِ مقطع" کی روایت بھی ہو گی جس سے "محفل" اپنے جوبن پر پہنچ جائے گی اور ان پر "اشعار" کی "آمد" ہونا شروع ہو جائے گی، اس نے کھڑے ہو کر ایک "آواز" لگائی تھی جو مجھے "رجزیہ شعر" معلوم ہوا کیونکہ اس کے بعد ہی جانے کہاں کہاں سے "شاعروں" کا اخراج ہوا تھا جو نہ صرف کیل کانٹوں سے لیس تھے بلکہ انہیں استعمال کرنے کے طریقوں سے بخوبی واقف بھی۔۔۔ طرّہ یہ کہ ساروں نے ایک ساتھ ہی اشعار کی نہ صرف یلغار کر دی بلکہ بڑھ بڑھ کر میرے "شعر" پر مجھے "داد" دینے کو بھی دوڑے۔ اب جن کو بھی شاعر سے پالا پڑا ہے انہیں معلوم ہو گا کہ اصلی غزلیں ہضم کرنا بھی کس قدر دردیلا کام ہے، چہ جائیکہ اتنے بھاری اور 'ہینگم' قسم کے "دیوان" جو وہ لئے میری طرف دوڑے تھے... چونکہ اتنی ساری "غزلیں" اور "کلام" میرے لئے برداشت کرنا محال تھا اور تکلیف دہ بھی۔۔۔ اس لئے میں نے بھی ایک ہاتھ سر پر رکھا اور ایک جیب پر اور جو دوڑ لگائی ہے تو پھر گھر میں آ کر ہی دم لیا

۔۔۔ دوسری منزل پر آ کر ان کو خوب منہ چڑایا اور بھڑاس نکالی۔ اس دِن کے بعد سے ان میں اور مجھ میں ٹھنی ہوئی ہے۔۔۔ میں ان کے "مشاعرے" میں جانے سے باز نہیں آتا اور انہیں بھی

''غزلیں، نظمیں'' سنانے کا اتنا شوق ہے کہ وہ پہلے سے سیروں غزلوں کا ڈھیر لگائے بیٹھتے ہیں کہ جن کو سُن کر گلا خشک ہو جاتا ہے، ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں اور انسان ''داد'' بھی نہیں دے پاتا ''مکرّر مکرّر'' کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی!۔۔۔ میرا ''حسنِ ظن'' تو یہاں تک کہتا ہے کہ وہ میری آمد پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور میری ''تواضع'' کرنے کے واسطے پکڑنے کو دوڑتے ہیں مگر میں ہی کچھ ''نخریلا'' واقع ہوا ہوں۔۔۔! میں ان کے مشاعرے کی ''صدارت'' کرنے سے باز ہی رہا، اس سے مجھے معلوم ہُوا کہ ہمیشہ ''حد'' میں رہنا چاہیے، اتنی چھوٹی چھوٹی سی حد توڑنے پر 'داد' وصول ہوتے ہوتے رہ گئی تو پھر بڑی حدود کا کیا کہنا۔ اگر حدودِ الٰہی میں سے کوئی حد ٹوٹتی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنے میں پڑ گئے ہو اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، کٹھ پتلی کی مانند۔۔۔ فوراً شریعت کی طرف رجوع کر لو اور اسکو مضبوطی سے تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو۔۔۔ اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی باطل ہے، باطل ہے، باطل ہے۔۔۔!

خیر، ایک دفعہ ذہین احمق آبادی جا رہا تھا میرے ساتھ پہاڑ پر ہی۔۔۔ مجھے تو معلوم تھا کہ وہاں ''شاعروں کے غول'' جمع ہوتے ہیں مگر جناب لاعلم تھے اس سے۔۔۔ ''شاعر'' آیا، میں تو بھاگ نکلا مگر ذہین کو اس نے ''شعر'' سنا ہی دیا۔۔۔ یا شاید میرے بدلے کی 'داد' دی ہو۔ میں کچھ دیر بعد ڈرتے جھجکتے واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جناب پڑے مانندِ بسمل تڑپ رہے ہیں۔ بھاگم بھاگ طبیب کا بندوبست کیا، بس پھر کیا تھا، چودہ ٹیکے لگوانے پڑے۔۔۔ ٹخنے کو۔۔۔ اور ساتھ ہی تیزاب سے غرارے بھی کرانے پڑے، تب کہیں جا کر کچھ افاقہ ہُوا۔۔۔!

دھت تیرے۔۔۔! نہیں۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ بعد میں کرینگے دھت۔۔۔ شعراء پر ''ذہین احمق آبادی'' کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔۔۔

ماجرا کچھ یوں ہے کہ ''ذہین احمق آبادی'' عالمِ رویا میں چہل قدمی کر رہا تھا کہ اسے کسی کی آواز سنائی دی، اس نے مڑ کر دیکھا تو جنابِ میرزا غالِب تھے۔۔۔ اس کے چودہ طبق ہی ویران ہو گئے۔۔۔ ''بیٹا! تیری شامت آئی ہے۔۔۔ اب سہہ اسے۔۔۔!'' اس نے منہ ہی منہ میں بدبداتے چلتے ہوئے سوچا۔۔۔

" کہاں ہو میاں۔۔۔! تو سنِ حماقت پر سوار۔۔۔ بھول بیٹھے اپنے دلدار۔۔۔ ہم سے کوئی ذہانت سرزد ہوئی جو اتنا ناقابلِ اعتناء جانا۔۔۔! ذرا ادھر بیٹھو ہمارے ساتھ آم بھی کھانا۔۔۔!" غالِب نے مخصوص مقفّٰی انداز و پیرائے میں بات کی۔

ظالم نے خوشبوئے آم کو طشت از بام کیا تو اس کے چودہ طبق آم ہو گئے۔۔۔ ''ذہین'' کی تمامتر ذہانت آم آم ہو گئی اور وہ آمادۂ حماقت ہو گیا۔۔۔ نتیجتاً وہ بھی غالِب کے ساتھ ہی ''آمی'' ہو کے رہ گیا۔۔۔ میرزا بولے۔۔۔ "میاں! اپنی تو ایک ہی خواہش ہے، آم ہوں اور بہت سے ہوں۔۔۔!"

ذہین ہاتھ روکے بغیر گویا ہوا۔۔۔ "میری بھی ایک خواہش ہے۔۔۔ لڑکیاں ہوں۔۔۔ اور بہت سی ہوں۔۔۔!"

دھت تیرے۔۔۔ نہیں ابھی بھی نہیں۔۔۔ غالِب نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا اور پھر کافی دیر سوچ بچار کے بعد پُر سوچ انداز میں گویا ہوئے۔۔۔ "یار۔۔۔ سوچ ہوں کوئی گول گپے کا ٹھیلا لگاؤں۔۔۔! اور اپنے دل کی مراد پاؤں۔۔۔!"

اب حیرت زدہ ہونے کی باری ذہین کی تھی، اُسے غالِب کا اتنا ''عامیانہ'' انداز پسند نہیں آیا تھا۔۔۔ " کیوں خیریت ہے بے۔۔۔!؟ دماغ تو نہیں چل گیا کیا۔۔۔ شاعری سے دِل اتنا ہی اکتائے ہے کیا اب، عقل پر آم تو نہیں پڑ گئے۔۔۔!؟"

اس کے استفسار پر غالب شرماتے لجاتے گویا ہوئے "وہ بیبیاں بڑے شوق سے کھاتی ہیں ناں تو اسی"

'اوئے غالِب۔۔۔! تُو بھی مغلوب ہو گیا۔۔۔؟ لگتا ہے عقل آم کی نذر کر دی، ویسے ان محترمات کو محرمات میں تبدیل کرتے عرصہ لگ جاتا ہے اور تمہاری عمر تو ویسے ہی قبر میں جھانک رہی ہے۔۔۔ ہاں میرے لئے راہ ہموار کر رہے ہو تو بصد دل و چشم۔۔۔!" ذہین نے اسکی کمر پر دھب رسید کرتے ہوئے کہا...!

اب کرلیں۔۔۔ دھت تیرے کی۔۔۔! جی ہاں۔۔۔!

ارمان یوسف

چینی سالِ نو، بکری اور برمنگھم

صاحبو! اب یہ مشکل آن پڑی ہے کہ آغاز کلام کہاں سے کیا جائے، یعنی بکری کی ذات بابرکات سے، برمنگھم کی رنگینیوں سے یا پھر چینی سالِ نو سے۔ کیونکہ درج بالا تینوں عنوان آپس میں ایسے جڑے ہوئے ہیں جیسے شاعری اور علامہ اقبال یا پھر علامہ اقبال اور شاعری۔ خیر سے اقبالؒ کا ذکرِ خیر تو یوں بھی ہر بار آجاتا ہے۔ تو کیوں نا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبالؒ کے اس معصوم سے شعر سے آغاز کیا جائے۔

یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

حضرتِ اقبال تو یہ شعر اپنی نظم ''ایک گائے اور بکری'' میں بچوں کی دل لگی کے لئے کہہ کر کب سے ابدی نیند سو بھی گئے مگر چینیوں کو بکری کی محبت میں خوابِ غفلت سے بیدار کر گئے یہ اور بات کہ بعد مدت کے اثر ہوا ہے۔ اس ہفتے سے چینی سال نو کا آغاز ہو رہا ہے، جشنِ بہاراں عروج پہ ہوگا۔ دنیا بھر سے بطور عام اور ملک بھر سے بطور خاص چینی کام کاجوں کو چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کا رخ کریں گے۔ یعنی اتنے لوگ سفر کریں گے کہ یہ سفر ہر سال کی طرح اس سال بھی دنیا بھر کی سب سے بڑی 'ہجرت' کہلائے گا۔ چین سرکار کے مطابق چالیس دن کے دوران تقریباً تین ارب بار سفر کیا جائے گا۔ اس سال کے جشن کی خاص بات اور موضوع یہ ہے کہ 'محبانِ بکری' کی ایک تنظیم کے ساتھ مل کر چینی اس سال کو بکری کے سال کے طور پر منا رہے ہیں۔

چونکہ برمنگھم میں بھی دنیا بھر کی طرح چینیوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے، لہٰذا یہ جشن برمنگھم کی گلی کوچوں میں بھی منایا جائے گا۔ چینی یہاں 1945ء سے آباد ہونا شروع ہوئے اور اب یہاں کل آبادی کا 1.2 فیصد خالص چینی ہے۔ تو یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہیں کہ چینیوں نے برمنگھم کی آبادی میں اپنا حصہ بقدر جثہ ملا کر اس شہر کو برطانیہ کا دوسرا بڑا گنجان آباد شہر بنا دیا ہے کیونکہ بزرگ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ گنجان شہر لندن ہی ہے اور یہ یورپ بھر میں سب سے زیادہ گنجان ہے۔ بزرگوں کے اس قول پہ شک کرنا گویا اپنی عاقبت خراب کرنے والی بات ہے۔ اور ان بزرگ

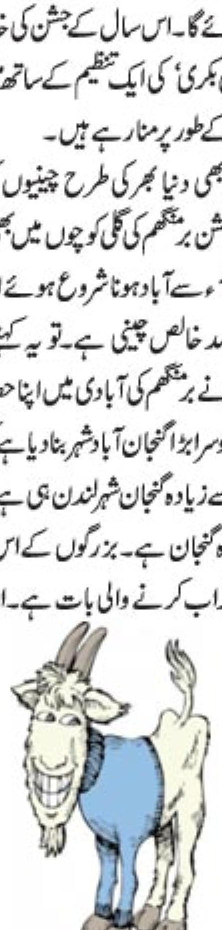

ہستیوں میں یاہوتایا، نانی گوگل اور پیڈیا والے وکی بڑے بھائی صاحب شامل ہیں۔ برمنگھم یوں تو گنجانی آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے مگر یورپ کی سب بڑی لائبریری بھی اسی شہر میں ہے، یورپ بھر میں سب سے زیادہ پارک اور باغات بھی یہیں پائے جاتے ہیں اور برمنگھم سٹی کونسل یورپ کی سب سے بڑی لوکل اتھارٹی سمجھی جاتی ہے۔ ویسے تو برمنگھم کو ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے جسے رسوائی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یعنی یورپ بھر میں سب سے زیادہ موٹے افراد بھی برمنگھم ہی میں پائے جاتے ہیں۔ ویسے آپ کے اور ہمارے درمیان اس وقت سوائے خدا کے کون موجود ہے؟ بھلا کیوں نا مٹاپے والا الزام چینیوں پر تھوپ دیا جائے کہ یہاں کے لوگ چینی کھانے کھا کھا کے موٹے ہوئے ہیں۔ یہ الزام اس لئے بھی کہ یہاں امریکی سازش والا فارمولا چلنے والا نہیں۔

خیر بات کرتے ہیں ''بکری کے سال' بارے۔ اس نئے چینی سال کو بکری کا سال قرار دینے والے اپنے چھ نکاتی ایجنڈے میں فرماتے ہیں:

پہلی بات تو یہ کہ بکری نہایت ہی شریف اور یار باش قسم کا جانور ہے اور یہ سچ میں انسان کی صحبت میں خوش رہتا ہے (انسان، انسان کے ساتھ اس قدر محبت اور اپنائیت سے رہتا تو آج دنیا جنت کا نمونہ ہوتی) ہاں انسان بھی اپنے دوست بکری سے خوش رہتا ہے اور یہ خوشی یار کا گرم گرم دودھ پیتے دوگنی اور بھنا گوشت کھاتے چار گنا ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ بکریاں خاندان اور حلقۂ ارباب دوست میں رہنا پسند کرتی ہیں لہذا دو سے کم بکریاں پالنا انتہائی زیادتی ہوگی۔

تیسرا قول یہ کہ بکریوں کو جنگلے میں ہر گز بند نہیں رکھنا چاہئے، کھلی فضا میں اٹھلاتی پھریں تو یہ اچھا ہے۔ بھلے یہ کھلی فضا ہمسائے کے کھیت کھلیان ہی کیوں نا ہوں۔

یہ بھی قرارداد کا حصہ ہے کہ بکریاں چونکہ دیواریں پھلانگنا پسند کرتی ہیں لہذا ایسی عمارت میں بکریوں کو ہرگز نہ رکھا جائے کہ جنہیں پھلانگتے ہوئے یہ اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھیں۔

باقی کے دو نکات پھر سہی۔ ابھی آپ ان چار نکات کو یاد کر لیں۔ کیا خبر فرشتے انہیں بھی اپنے سوال نامے میں شامل کر لیں۔ پھر نہ کہئے گا کہ خبر نہیں ہوئی۔

وما علینا الا البلاغ۔

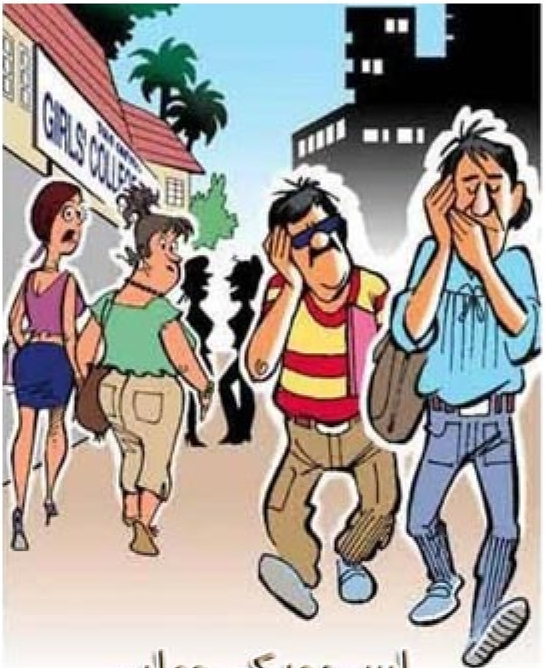

اس دور کے جواں ...

(ایک لرک)

بے فیض اِن کے آگے مت حکمتیں بگھارو
اس دور کے جواں ہیں، ان کی نظر اتارو
نہ کان دُکھ رہا ہے
نہ درد دانت کا ہے
سب مبتلائے چیٹنگ، سیل فون پر ہیں یارو!

نوید ظفر کیانی

سید بدر سعید

تعزیت نامہ

پچھلے ہفتے ہمارے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ارے! پریشان مت ہوں یہ وہ والے ''ب'' المعروف شاہ صاحب نہیں ہیں جو اکثر و بیشتر ہمیں اور قارئین کو مشورے دیتے رہتے ہیں۔ یہ دوسرے والے صاحب ہیں۔ ان کے ہم نام ہیں اور ہم کام بھی۔

آج صبح کی بات ہے، ہمارا دل بے چین ہو رہا تھا بار بار شاہ صاحب کی یاد آ رہی تھی، سوچا ان سے ملاقات کی جائے شاید شیطان بھی خوش ہو جائے کہ اس کے شاگرد ابھی تنہا نہیں ہیں۔ چنانچہ صبح صادق کے وقت نماز پڑھے بغیر گھر سے نکلے۔ ڈاکٹر نے بھی روزانہ دو میل سیر کرنے کا مشورہ دیا تھا سوچا اسی بہانے وہ بھی خوش ہو جائے گا۔ ویسے بھی ان کا گھر تو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا لہٰذا ایک میل اگلے روز پر ادھار ہو جائے گا اور اگلی صبح صرف ایک میل سیر کرنی پڑے گی۔ بس یہی سوچ کر گاڑی نکالی اور شاہ صاحب کی طرف چلے گئے۔ اب آپ سے کیا پردہ دو میل پیدل چلنے سے سانس پھول جاتا ہے اور ہم تھک بھی جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر کے حکم کی تعمیل بھی ضروری ہے تاکہ صحت خراب نہ ہو بس یہی سوچ کر صبح شام بلاناغہ گاڑی پر دو دو میل سیر کرتے ہیں۔

''ب'' المعرف شاہ صاحب کا محلہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ پاکستان کی ہر سوغات وہاں موجود تھی۔ خاص طور پر کیچڑ اور دھول تو بہت زیادہ تھی۔ ایک طرف ایک بچہ الف ننگا دیوار پر ''نقش و نگار'' بنا رہا تھا۔ بہر حال ان سب سے بچتے بچاتے شاہ صاحب کے گھر تک پہنچے۔ اطلاعی گھنٹی یعنی بیل پر انگلی رکھی تو معلوم ہوا لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے اسکی زبان قابو میں ہے۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا اور گلی سے اینٹ کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر لوہے کے دروازے پر کھینچ مارا لیکن اتنا خاص فرق نہ پڑا، ہم نے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا تین چار پتھر اُٹھا کر گھر کے اندر پھینک دیے، ایک ڈنڈا اُٹھایا اور دروازے پر مار کر باقاعدہ ڈھول بجانا شروع کر دیا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد اندر سے ایک بزرگ نمودار ہوئے، ہم نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاتھ میں بھی ایک عصا تھا۔ اب معلوم نہیں سہارے کی غرض سے تھام رکھا تھا یا باقاعدہ مقابلہ کرنے کی نیت سے لائے تھے۔ ہمیں دیکھ کر کچھ جھنجھلا سے گئے اور غصے سے کہنے لگے:

''بھائی! صبر نہیں ہوتا آپ سے؟

ہم نے ان کی طرف دیکھا اور ادب سے فرمایا:

''قبلہ! ہم سے تو صبر ہو جائے گا لیکن اگر فرشتے سے صبر نہ ہوا تو پھر دروازہ کون کھولے گا؟''

شاید وہ ہماری بات کی تہہ تک پہنچ گئے کیونکہ ان کے چہرے پر برہمی کے آثار نمایاں تھے۔ ہم نے ان کا غصہ ختم کرنے کی نیت سے کہا:

''جناب! آپ کے چہرے سے تو معلوم ہوتا ہے کہ نمازی پرہیزگار ہیں اور آپ ہیں کہ اتنی دیر سے دروازہ کھولنے آئے ہیں''۔

انہوں نے مندھی مندھی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور کہنے لگے:

''نہیں نہیں، میں تو وظیفہ کر رہا تھا۔''

ہم کہنے لگے تھے کہ جناب آپ غلط سمجھے ہیں، نمازی پرہیزگار سے ہماری مراد یہ تھی کہ آپ بھی ہماری طرح نماز سے مکمل پرہیز کرتے ہیں، لیکن ہم کہہ نہیں پائے کیونکہ ہمیں اس بات پر حیرت تھی کہ ''ب'' المعروف شاہ صاحب کے گھر میں یہ کون صاحب ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے۔ ابھی ہم پوچھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ انہوں نے پوچھ لیا:

''میاں! کہاں سے تشریف لائے ہیں اور کیا کام ہے؟''

ہم نے کہا:

''ب'' المعروف شاہ صاحب کو بلا دیں ہم ان کے جگری دوست ہیں۔''

کہنے لگے:

''وہ تو انتقال کر گئے۔''

''کب؟''

ہمارے منہ سے بس اتنا ہی نکلا اور وہ صاحب تفصیل بتانے لگ گئے کہ پچھلے ماہ فلاح تاریخ کو فلاح دن اتنے بجے انتقال کر گئے تھے۔ ہم سے تو سنا ہی نہ گیا اور چپ چاپ واپس چلے آئے۔ پیچھے سے وہ صاحب آوازیں دے رہے تھے:

''اجی سنیئے تو سہی! اگر آپ نے ان سے ملنا ہو تو میں آپ کو پہنچانے کا بندوبست کروا دیتا ہوں۔''

ہم نے فوراً لاحول پڑھی اور کہا:

''بڈھے! عمر تو تمہاری ہے تم خود چلے جاؤ'' وہ کہنے لگے

''آپ چلیں میں بھی پیچھے پیچھے آ جاؤں گا۔''

ہم نے کوئی جواب دیے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔

ہانپتے ہانپتے گھر آئے اور اسی وقت سوگ کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی کہلا بھیجا کہ چالیس دن تک گھر میں چولہا نہیں جلے گا لہٰذا چالیس دن تک کھانا بازار سے منگوایا جائے اور اوون میں گرم کیا جائے۔ چائے بھی چولہے کی بجائے برقی کیتلی میں پکائی جائے۔ زیادہ ضرورت ہو تو ہمسایوں کے گھر جا کر پکالیں لیکن ہمارے گھر چالیس دن تک چولہا نہیں جلنا چاہیے۔

اس وقت سے اپنے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب کی یاد میں پاگل سے ہوئے جا رہے ہیں، ان کی باتیں یاد آ رہی ہیں، ہمیں احساس ہو رہا ہے کہ وہ کتنے نیک تھے۔ ان سے منسوب وہ باتیں دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہیں جو ان میں سرے سے ہی نہیں تھیں لیکن اب چار سو پھیل جائیں گی۔

دیدہ دلیری

اِتنی دیدہ دلیری ظفرؔ
کب قزاقوں کے کرتوت ہیں
قوم کو باندھ کر لوٹنا
رہنماؤں کے کرتوت ہیں

نوید ظفرؔ کیانی

کھٹی میٹھی باتیں

"رحمۃ اللہ" ہم نے مُردوں کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے، حالانکہ زندوں کو اللہ کے رحم اور رحمت کی زیادہ ضرورت ہے۔ لیکن نجانے کیوں کسی زندہ کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ لگا دیا جائے تو وہ مائنڈ کر جاتا ہے۔

یہی حال "انا للہ وانا الیہ راجعون" کا بھی ہے۔ اس آیت کو ہر مصیبت، مشکل میں پڑھنا چاہئے لیکن ہم نے موت کی خبر کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے۔ کیا زندگی، موت سے بڑی مصیبت نہیں؟

اب اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی ملک صاحب کی طرح کسی کی شادی کا سن کر انا للہ پڑھ لیں یا کسی دلہن کے نام کے ساتھ رحمہ اللہ لگا دیں۔

شوکت علی مظفر

موصوف بہت ہی نرم دل کے مالک تھے اس لیے کسی لڑکی کو دکھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ایک مسکراہٹ کے عوض موبائل میں کارڈ ڈلوا دیا کرتے تھے۔ گرلز کالج کی تمام لڑکیوں کو باری باری گھر تک چھوڑنے جایا کرتے تھے۔ اگر کوئی خود چلی جاتی تو گھنٹوں افسوس کرتے اور غمگین رہتے کہ معلوم نہیں سفر کی تکالیف کیسے برداشت ہوں گی۔ کہیں راستے میں ان کے علاوہ کسی اور نے ہی نہ چھیڑ دیا ہو وغیرہ وغیرہ۔

ہمیں یہ بھی خیال آ رہا ہے کہ ان کی وفات پر پورا محلہ کس طرح دھاڑیں مار مار کر رویا ہوگا شاید ہی دنیا میں کوئی ہو جسکے مرنے پر لوگ اس طرح روئے ہوں کیونکہ موصوف نے تمام عمر کہیں نوکری نہیں کی ہمیشہ ادھار کے بل بوتے پر گھر چلایا اور عیش کی، اور کبھی کسی کا ادھار واپس نہیں کیا۔ ہمیں رشک آتا ہے کہ موصوف کس شان سے جیئے۔ ان کو چھینک بھی آتی تو چار چار کوس دور تک لوگ ان کی لمبی عمر کی دعائیں کرتے اور اس وقت تک سجدے سے سر نہ اُٹھاتے جب تک یہ اپنی خیریت کی اطلاع نہ پہنچا دیتے۔ کم بخت ہم سے بھی تین چار مرتبہ چار سو بیس روپے ادھار کر چکے تھے، نہ ایک روپیہ کم نہ ایک روپیہ زیادہ۔ جب بھی مانگے اتنے ہی مانگے، آہ! وہ پیسے بھی ڈوب گئے۔

ہائے افسوس! دنیا نے ان جیسا ذہین شخص کھو دیا، ذہانت تو ان پر ہی ختم ہوئی تھی، اتنے ذہین تھے کہ کوئی کیا ہی ہو۔ آٹھویں پاس کرنے کے بعد سارے شہر میں منادی کروا دی کہ آدھا ایم اے کر لیا ہے۔ ہم نے پوچھا کیسے، تو کہنے لگے "سولہویں جماعت کو ایم اے کہتے ہیں اس لحاظ سے آٹھویں جماعت آدھا ایم اے ہوا یا نہیں" لوگ ان کی عمر دیکھ کر اعتبار کر گئے کہ واقعی اس عمر میں آدھا ایم اے ہی کیا ہوگا بلکہ اگر یہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا کہتے تو لوگ اس پر بھی اعتبار کر لیتے۔ تقریباً پانچ سال بعد میٹرک تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا تو پھر منادی کروا دی کہ ایم اے (ٹرک) انگلش، سیاسیات، فلسفہ وغیرہ تو سب کرتے ہیں لہٰذا ایم اے (ٹرک) کا پوچھا کہ "یہ کہاں سے آیا؟" تو کاغذ پر کچھ لکھ کر ہمارے طرف سرکا دیا کہ "یہاں سے!" ہم نے چٹ پڑھی تو لکھا تھا (M.A. Tric) یعنی میٹرک کو توڑ توڑ کر ایم اے ٹرک بنا دیا تھا۔ اب ایسا ذہین دنیا میں اور کون ہوگا۔

دین دار اتنے تھے کہ کبھی مسجد میں نماز نہ پڑھی کہ کہیں دکھاوا نہ ہو اور لوگ نیک اور نمازی کہہ کر عبادت ضائع نہ کر دیں۔ ویسے تو گھر میں بھی نہ پڑھتے تھے کہ مردوں کو گھر میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ اشد مجبوری نہ ہو تو گھر میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ کہتے تھے جب تک کوئی مجبوری در پیش نہ آئے گھر میں کیسے پڑھوں؟ اللہ کا کرم تھا کہ تمام عمر یہی محسوس کرتے رہے کہ کوئی مجبوری نہیں ہے۔

آہ! دنیا کا سب سے کامیاب بزنس مین اُٹھ گیا ہے۔ موصوف کمال کا کاروباری ذہن رکھتے تھے ان جیسا کاروباری شخص ہم نے روئے زمین پر نہیں دیکھا۔ جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو کہیں نوکری نہ کی۔ ان کے والد صاحب بھی اُٹھتے بیٹھتے یہی کہتے تھے کہ "نالائق کو کہیں نوکری نہیں ملے گی" لیکن ہمارے خیال میں ایسی بات ہرگز نہ تھی بلکہ موصوف کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ لہٰذا ایک دن خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ مخالف تو یہاں تک کہتے ہیں

> میاں بیوی کا رشتہ اس طرح ہے جیسے پبلک واٹر کولر کے ساتھ آہنی زنجیر سے گلاس بندھا ہوا ہوتا ہے۔ گلاس خالی ہو تو کولر کے قدموں میں پڑا دکھائی دیتا ہے، بھرا ہو تب بھی ایک مخصوص حد تک دور جا سکتا ہے۔
>
> شوکت علی مظفر

کہ گھر والوں نے مار مار کر گھر سے نکال دیا تھا لیکن ایسی کوئی بات ہرگز نہیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ حسد کرنے والے ایسی باتیں کرتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کے مخالف کبھی کبھی ایسی ہی سچی بات کر جاتے ہوں گے۔ ان باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔ بہر حال موصوف نے راتوں رات گھر چھوڑ دیا شاید ان کے ذہن میں ہو گا کہ "سفر وسیلہ ظفر" ہے یا پھر اس نقطہ نظر سے چھوڑ دیا ہو گا کہ کاروبار میں سفر خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ بہر حال تاریخ سے ثابت ہے کہ موصوف نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ کئی دن حالتِ سفر میں رہے اور پھر اچانک حالتِ قیام میں آ گئے۔ اپنی ایم۔ اے (ٹرک) کی سند کو دس فٹ کی گہرائی میں دفن کر دیا اور بچوں کو پھونکیں مارنے کا کام شروع کر دیا اور پھر دن بدن ترقی کرتے چلے گئے۔ سرکاری نل کے پانی پر پھونک مارتے اور منرل واٹر سے بھی مہنگا بیچ دیتے۔ یہاں تک کہ کھانسی آتی تو بھی پاس بیٹھے کسی مرید کے منہ پر کھانستے اور سو روپیہ کھرا کر لیتے۔ اب اس سے بڑا اور کامیاب کاروبار کون کر سکتا ہے؟ ہائے! اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے دنیا نے ایک قیمتی دماغ کھو دیا۔

ان کے متعلق کیا لکھوں؟ وہ تو ہر کام میں یکتا تھے۔ محلے میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جہاں کوئی لڑائی ہوئی ہو اور اس لڑائی اور فساد کی وجہ میرے دوست "ب" المعروف شاہ صاحب نہ ہوں۔ ایسے کاموں میں ان کا دماغ خوب چلتا تھا۔ اب آپ سے کیا چھپانا کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کئی کئی دن گزر گئے اور محلے میں کوئی فساد نہ ہوا، ایسے میں سارا محلہ ویران ویران سا لگتا۔ نہ کوئی شور شرابہ، نہ کوئی ہلہ گلہ، شاہ صاحب چونکہ کافی حساس دل کے مالک تھے لہٰذا ان سے محلے کی یہ ویرانی اور یکسانیت دیکھی نہ جاتی۔ میں خود اس بات کا گواہ ہوں کئی مرتبہ ایسا ہوا انہوں نے فٹ پاتھ پر بیٹھی کسی خوبصورت یا پھر قبول صورت فقیرنی کا انتخاب کیا، گھنٹوں فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اسے منایا اور اس کام پر کسی قسم کی شرمندگی محسوس نہ کی پھر اسے اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر گھر لے آتے۔ گھر لا کر شاہ صاحب اسے ایک قیمتی لباس پہناتے، ہمارا مطلب ہے پہننے کے لیے عنایت کرتے، اپنے پاکیزہ ہاتھوں سے میک اپ کرتے اور پھر گھر سے نکال باہر کرتے، باہر گلی میں وہ کسی صاحب سے ساتھ والے محلے کے کسی گھر کا پتہ پوچھتی اور صاحب اسے پتہ سمجھا رہے ہوتے تو شاہ صاحب چھپ کر ان کی تصویر اتار لیتے۔ یہ عمل کئی مرتبہ دہرایا جاتا پھر وہ شاہ صاحب کے گھر آتی، شاہ صاحب اسے اس کا لباس تھماتے اور اپنا قیمتی لباس اگلی مرتبہ کے لیے سنبھال کر رکھ لیتے۔ اپنی جیب سے اسے اس کا معاوضہ ادا کرتے اور گھر سے نکال باہر کرتے۔ جن جن لوگوں کی تصاویر اتاری ہوتیں وہ ان کی بیگمات تک پہنچا دیتے اور معصوم سی شکل بنا کر کہتے "باجی! آپ کے بھلے کے لیے آپ کو یہ تصاویر دکھا رہا ہوں، صاحب آج کل اس فاحشہ کے ساتھ نظر آ رہے ہیں، میرا مقصد آپ کو آگاہ کرنا تھا مگر براہ مہربانی صاحب سے لڑیئے گا مت، وہ دل کے بُرے نہیں اور میرا نام تو ہرگز نہ لیجئے گا۔ بس صاحب یہ تو واپس آ جاتے لیکن بیگم صاحبہ وہی کرتیں جو ایسی صورت حال کے بعد کوئی بیگم کر سکتی ہے۔ محلے والوں کو بھی مفت میں ایک ڈرامہ دیکھنے کو مل جاتا، قسم سے ہمارے دوست "ب" المعروف شاہ صاحب بہت ہی زندہ دل شخص تھے لیکن افسوس اب وہ ہم میں نہیں رہے، آہ! زمین کیسے کیسے ہیروں کو نگل گئی۔

ہم "ب" المعروف شاہ صاحب کی شان میں اور بھی بہت کچھ لکھتے کہ ابھی تو ان کی شخصیت پر کچھ بھی نہیں لکھا وہ تو اپنی ذات میں ایک سمندر ہیں لیکن بُرا ہوا ایک دوست کا جو اس بُرے وقت میں آ دھمکا ہے اور اس نے انکشاف کیا کہ ہمارے عزیز جان دوست "ب" المعروف شاہ صاحب زندہ ہیں اور وہ ابھی انہی سے مل کر آ رہا ہے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی کہ کس کی بات کا یقین کریں اس دوست کا یا ان بابا جی کا جو "ب" المعروف شاہ صاحب سے گھر

سے برآمد ہوئے تھے۔ لیجئے دوست نے ان سے فون پر بات بھی کروادی وہ واقعی زندہ ہیں۔ ہم نے پوچھا باباجی تو کہہ رہے تھے کہ آپ انتقال کر گئے ہیں، کہنے لگے "ہاں واقعی انتقال کر گیا ہوں" اب تو ہم واقعی چکرا گئے اور پوچھ ہی لیا "کیا مطلب؟ اگر انتقال کر گئے ہو تو کیا اب دوزخ سے فون کر رہے ہو" قہقہہ لگا کر بولے "دنیا سے آخرت کی طرف انتقال نہیں کیا، ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ اور ایک گھر سے دوسرے گھر انتقال کر گئے ہیں، جیسے انسان زمین کسی دوسرے کے نام انتقال کرواتا ہے، جسے انگلش میں ٹرانسفر بھی کہتے ہیں اور اردو میں منتقل ہونا بھی کہتے ہیں" ہم نے فوراً ڈکشنری دیکھی، واقعی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کو انتقال ہی کہتے ہیں۔

انتقال کی اصلیت جان کر ہمارا اور براحال ہوگیا۔ ہم چلاتے ہوئے کہنے لگے "بُرا ہو تیرا، کمبخت ہماری تم سے کیا دشمنی ہے؟ ہم نے تو اچھا خاصا مضمون لکھ لیا تھا لیکن تم ہمیں خوش نہیں دیکھ سکتے، کیا تھا جو ہمیں تھوڑا معاوضہ مل جاتا گھر کا خرچ نکل آتا، لیکن تم ہو کہ ابھی تک زندہ ہو۔

ہم نے فون بند کر دیا اب رہ رہ کر اپنا نقصان یاد آرہا ہے جو شاہ صاحب کے زندہ ہونے کی وجہ سے ہوگیا کہ اگر وہ مر گئے ہوتے تو ان کی یاد میں لکھا جانے والا یہ مضمون کہیں نہ کہیں شائع ہو جاتا اور کوئی نہ کوئی ہمیں کچھ نہ کچھ معاوضہ دے چکا ہوتا۔ بہر حال قارئین آپ یہی سمجھیں کہ ہمارے دوست "ب" المعروف شاہ صاحب اس مضمون کے شائع ہونے تک مرے ہوئے ہیں۔

لہٰذا شاہ صاحب انتقال کر گئے۔۔۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔۔۔ کلمہ شہادت۔۔۔۔۔!!!!!

بھارت

یہ بھارت ہے، گاندھی جی یہیں پیدا ہوئے تھے، لوگ اُن کی بڑی عزت کرتے تھے، اُن کو مہاتما کہتے تھے، چنانچہ مار کر اُن کو یہیں دفن کر دیا اور سمادھی بنادی، دوسرے ملکوں کے بڑے لوگ آتے ہیں تو اس پر پھول چڑھاتے ہیں، اگر گاندھی جی نہ مرتے یعنی نہ مارے جاتے تو پورے ہندوستان میں عقیدت مندوں کیلئے پھول چڑھانے کی کوئی جگہ نہ تھی، یہی مسئلہ ہمارے یعنی پاکستان والوں کے لئے بھی تھا، ہمیں قائدِ اعظم کا ممنون ہونا چاہئیے کہ خود ہی مر گئے اور سفارتی نمائندوں کے پھول چڑھانے کی ایک جگہ پیدا کر دی ورنہ شاید ہمیں بھی اُن کو مارنا ہی پڑتا۔

بھارت بڑا امن پسند ملک ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے سیز فائر کے معاہدے ہو چکے ہیں، ۱۹۶۵ء میں ہمارے ساتھ ہوا اس سے پہلے چین کے ساتھ ہوا۔

بھارت کا مقدس جانور گائے ہے، بھارتی اس کا دودھ پیتے ہیں، اسی کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں، اور اس کو قصائی کے ہاتھ بیچتے ہیں، اس لیئے کیونکہ وہ خود گائے کو مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔

آدمی کو بھارت میں مقدس جانور نہیں گنا جاتا۔

بھارت کے بادشاہوں میں راجہ اشوک اور راجہ نہرو مشہور گزرے ہیں۔ اشوک سے ان کی لاٹ اور دہلی کا شوکا ہوٹل یادگار ہیں، اور نہرو جی کی یادگار مسئلہ کشمیر ہے جو اشوک کی تمام یادگاروں سے زیادہ مضبوط اور پائیدار معلوم ہوتا ہے۔

راجہ نہرو بڑے دھرماتما آدمی تھے، صبح سویرے اٹھ کر شیر شک آسن کرتے تھے، یعنی سر نیچے اور پیر اوپر کر کے کھڑے ہوتے تھے، رفتہ رفتہ اُن کو ہر معاملے کو اُلٹا دیکھنے کی عادت ہوگئی تھی، حیدرآباد کے مسئلہ کو انہوں نے رعایا کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ یوگ میں طرح طرح کے آسن ہوتے ہیں، ناواقف لوگ اُن کو قلابازیاں سمجھتے ہیں، نہرو جی نفاست پسند بھی تھے دن میں دو بار اپنے کپڑے اور قول بدلا کرتے تھے۔

اُردو کی آخری کتاب از ابنِ انشاء

سکندر حیات بابا

ادیبوں کی اقسام

ہمارے ہاں چار قسم کے انسان پائے جاتے ہیں نمبر ایک مرد، نمبر دو عورت، نمبر تین خسرے، اور نمبر چار ادیب، آپ حیران ہونگے کہ ادیبوں کی قسم بھلا کیونکر الگ ہوئی ادیب بھی مرد عورت یا خسرے میں سے ہی کوئی ہوتا ہوگا، جناب اگر آپ پہلے زمانے کی بات کر رہے ہیں تو آپ صحیح ہیں لیکن اگر بات ہو رہی ہے فیسبکی جدید دور کی تو آپ کی کم علمی قابل افسوس ہے۔

چلیں تو آج ہم آپ کو ادیبوں کی قدیم اور کچھ جدید اقسام سے آگاہ کرتے ہیں، اور پھر فیصلہ بھی آپ پر چھوڑ دیتے ہیں،

نشئی ادیب

یہ ادیب کبھی سچ کہنے سے نہیں ڈرتا، لیکن جب تک ٹن ہو، اسکا سچ اتنا دو ٹوک اور تلخ ہوتا ہے کہ ہوش میں آتے ہی اپنی تحریر پڑھ کر خود اسکے ہاتھوں کے طوطے کبوتر اور کوے سب اڑ جاتے ہیں، نشئی ادیب کا ضمیر زندہ رہتا ہے، ایسا نہیں کہ اسے خریدا نہیں جاسکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اسے خرید کر بھی اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ جب یہ ٹن ہوتا ہے تو صرف اندر کی آواز سنتا ہے، اسی لئے نشئی ادیب کا ادب بہت گہرا ہوتا ہے اور پڑھنے والا بھی اگر زیادہ گہرائی میں اتر جاؤ تو لاپتہ ہو جاتا ہے،

نشئی ادیب کا ادب شرمناک، دوستی خطرناک، ، زندگی افسوسناک اور موت دردناک ہوتی ہے، یہ بیچارہ جب تک زندہ رہتا ہے لوگ اسے پتھروں سے مارتے ہیں اور جب مر جاتا ہے تو اس کا مزار بنا کر قبر کے پتھر چومے جاتے ہیں،

ٹھرکی ادیب

ٹھرکی ادیب اگر چہ عمرو عیار کے زمانے سے بھی پہلے کے ہیں لیکن فیسبکی دور شروع ہونے کے بعد ان میں خاطر خواہ اضافہ ہوا، ہم نے اپنے گہرے مشاہدے سے پایا کہ فیس بک پر ہر تیسرا آدمی ادیب اور ان میں ہر دوسرا ٹھرکی ادیب ہے، ٹھرکی ادیبوں نے ادب کی وہ بے ادبی کی کہ ادب کی چیخیں نکل گئیں، ادب اگر کسی انسانی شکل میں ہوتا تو ان لوگوں پر اجتماعی بلدکار کا پرچہ کٹوا دیتا، ٹھرکی ادیب خواتین کو "سادہ کاغذوں" پر اصلاح دینے کیلئے کافی معروف ہیں اور ان کے اسی جذبہ خدمت خلق کے بدولت عجیب و غریب میک اپ سے لتھڑی ہوئی ادیباؤں کی تصاویر فیس بک پر جگمگاتی نظر آتی ہیں، ایسی ادیباؤں نے اک ادائے بے نیازی سے وہ ناز بھرے اشعار وال پر لگاؤ رکھے ہوتے ہیں کہ اگر منیر نیازی صاحب حیات ہو کر انہیں دیکھ لیں تو حبیب بینک سے کود جائیں، حبیب بینک سے بھی اسلئے کے فی الحال اس سے بڑی عمارت ہمارے ہاں دستیاب نہیں، آپ اگر بدقسمتی سے شاعر ہیں اور اصلاح لینا چاہتے ہیں اور مزید بدقسمتی سے آپ انہیں میسج کر کے اس خواہش کا اظہار بھی کر دیتے ہیں تو پہلے پہل تو آپ کو بالکل توجہ نہیں دی جائیگی اور زیادہ تنگ آکر بادل نخواستہ اگر کوئی متوجہ ہو بھی گیا تو آپ کی غزل میں وہ کیڑے نکالے جائیں گے کہ آپ خود سے نظریں نہیں ملا پائیں گے، آپ کو سخت لعن طعن اور ملامت کا نشانہ بنا کر آپ کی پیدائش کو ادب کیلئے عظیم سانحہ قرار دیا جائیگا اور عین ممکن ہے کہ اگر آپ کے اعصاب کمزور ہوں تو آپ کو شاعری کے نام سے وحشت ہو جاؤ بلکہ دل کے ایک آدھ دورے کے امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا، ٹھرکی ادیبوں کی بدولت ہی جینوئن شاعرات منظر سے غائب ہوئیں یا پھر آنے کا حوصلہ نہیں کرتیں اور ان ہی کی بدولت متشاعرات اور بدادیباؤں کی تعداد میں اِس قدر اضافہ ہوا کہ انہیں بیرون ممالک برآمد کر کے اچھا خاصا زرِ مبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔

فلاسفر ادیب

یہ ادیبوں کی وہ قسم ہے کہ اگر آپ ان کو قسم دے کر کہہ دیں کہ انہیں خود اپنی بات سمجھ آئی تو شاید جواب اثبات میں نہ ملے۔ اِن کا ہر اک جملہ سوال ہوتا ہے اور ہر سوال کا جواب بھی سوال ہی ہوتا ہے اور پھر اس جوابی سوال پر بھی یہ خود ہی سوال اٹھا دیتے ہیں، فلاسفر ادیب کو مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا اور اس پر بات کر کر کے وہ کسی کی بھی طبیعت خراب کر سکتا ہے، منطق (Logic) کا استعمال مت مارنے کو کرتا ہے اور جمالیات (Aesthetics) کی گہرائی میں اتر کر انکا بیڑا غرق کرنے میں اسکا کوئی ثانی نہیں، فلاسفر ادیب دراصل وہ شخص ہے جس کے ساتھ بچپن میں کوئی نہیں کھیلتا تھا یا پھر گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے اسے باری کبھی نہیں دی جاتی اور صرف دوڑایا ہی جاتا تھا،

فسادی ادیب

اِنہیں شیطان کے خصوصی چیلے ہونے کا اعزاز حاصل ہے، اور یہ لال بیگ کی طرح ہر زمانے میں پائے جاتے رہے ہیں فی زمانہ ان کی تعداد امریکن سنڈیوں سے بھی زیادہ ہے، فسادی ادیب نہ تین میں ہوتے ہیں نہ تیرہ میں، لیکن ہر کسی سے دو دو ہاتھ کرنے کو بے تاب رہتے ہیں، ہمارے سیاستدان الیکشن جیت کر اپنے حلقے سے یوں غائب نہیں ہوتے جیسے یہ کہیں پر فساد برپا کرنے کے بعد منظر سے فرار ہو جاتے ہیں۔

فسادی ادیب سچی خوشی کے معنی حقیقی معنوں میں سمجھتا ہے اور اسی "سچی خوشی" کے حصول کے لئے جو اسے فساد سے حاصل ہوتی ہے فساد برپا کیے رکھتا ہے، ایسے ادیبوں کا ایک ہی علاج ہے کہ انہیں نظر انداز کر دیا جاؤ ورنہ اتفاق یا اختلاف دونوں صورتوں میں جس صورتحال کا سامنا آپ کو کرنا پڑ سکتا ہے اسے ہرگز خوشگوار نہیں کہا جا سکتا۔

غمگین ادیب

اگر آپ کا کوئی دوست نما دشمن ہے جس سے آپ کو بدلہ لینا ہو، تو غمگین ادیب کا ادب اس کام کو بخوبی سرانجام دے سکتا ہے، یہ وہ ادیب ہوتے ہیں جنکا کام سرد آہیں بھر بھر کر موسم کا درجہ حرارت متوازن رکھنا ہوتا ہے، اِن کی اسی خوبی کی بدولت سائنسدان گلومنگ وارمنگ کے پیش نظر انہیں زمین کی بقا کیلئے مفید مخلوق قرار دیتے ہیں، غمگین ادیب بہت زیادہ ٹیلنٹڈ ہوتا ہے یہ ہر خوشی کے موقع پر یا منظر میں وہ غم تلاش کر لیتا ہے جو غم کو خود بھی معلوم نہیں ہوتے، غمگین ادیب اگر شاعر ہو تو بلا کا مبالغہ طراز ہوتا ہے، یہ ایک مصرعے میں دونوں جہان محبوب پر قربان کر دیتا ہے لیکن اگلے ہی مصرعے میں پرسوں رات نہر والے پل پر دوران انتظار مچھروں کے کاٹنے کی درد بھری کیفیت کو بیان کرتا ہے، زندگی میں اگر خوشی مطلوب و مقصود ہو تو غمگین ادیب سے اتنا ہی دور رہئیے جتنا ہمارے سیاستدان شرم سے اور ہماری پولیس ایمانداری سے رہتی ہے۔

تنگ نظر ادیب

تنگ نظر ادیب سے مراد ہرگز وہ ادیب نہیں جنکی دور یا قریب کی نظر کمزور ہو بلکہ یہاں بیان ان نفسیاتی ادیبوں کا ہے جو خود ساختہ دانشور اور "برائی" کے خلاف سماجی ٹھیکیدار ہوتے ہیں، ان کی بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں، یہ ضرورت سے زیادہ مذہبی شدت پسند بھی ہوتے ہیں جو ہر ایک اختلاف پر کفر کا فتویٰ داغ کر آپ کا نکاح منسوخ کر دیتے ہیں یا پھر یہ بہت زیادہ روشن خیال بھی ہو سکتے ہیں جو آپ کے سر پر رکھی ٹوپی کی وجہ سے ہی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں اور وہ اول فول بکنا شروع کر دیتے ہیں کہ آپ ان کی ایک کسی ایک تحریر سے بھی گالیوں کے حوالے سے اپنے ذخیرہ الفاظ میں اچھا خاصہ اضافہ کر سکتے ہیں، دراصل یہی وہ ادیب ہیں جن کی وجہ سے ہم نے مضمون کے آغاز میں کچھ ادیبوں کو مرد و عورت اور خسروں کی فہرست سے الگ بیان کیا، یہ خود کو مرد کہتے ہیں، کوسنے عورتوں کی طرح دیتے ہیں اور حرکتیں خسروں والی ہوتی ہیں، لہٰذا انہیں ان سب سے الگ قرار دیا جانا ان کا حق بنتا بھی ہے۔

محمد ایوب صابر

باتھ روم سنگرز

تقریباً ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا باتھ روم سنگر چھپا ہوتا ہے۔ بعض دفعہ آدمی کو باتھ روم سے باہر نکلنے یا اس کے اندر چھپے ہوئے سنگر کو ظاہر ہونے میں زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔ اس ظہور کے لئے آواز سے زیادہ باتھ روم کا سائز اہم ہوتا ہے۔ اگر باتھ روم چھوٹا ہو تو اس کے اندر راگ درباری گانا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ راگ درباری کے لئے جہازی سائز کا باتھ روم درکار ہے۔

میں آپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ آخر لوگ باتھ روم میں جا کر گانا کیوں گاتے ہیں۔ یہ سب بالی وڈ کے آنجہانی فلمی ہیرو سنجیو کمار کی کارستانی ہے۔ جنہوں نے فلم ''پتی پتنی اور وہ'' میں:

''ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہانا چاہیے
گانا آئے یا نہ آئے، گانا چاہیے''

یہ نظریہ پیش کر کے لوگوں کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرنے کی ہے کہ اگر سردیوں کے موسم میں نہاتے وقت پانی ٹھنڈا لگے تو آپ گانا شروع کر دیں۔ اس طرح پانی کی ٹھنڈک کا احساس رفو چکر ہو جائے گا اور اضافی فائدے کے طور پر آپ کے لئے سنگر بننے کے مواقع بھی نکل سکتے ہیں۔ مذکورہ گانے میں دوسرا سبق یہ دیا گیا ہے کہ گانا گانے کے لئے سریلا ہونا قطعی ضروری نہیں بلکہ سننے والوں کا حوصلہ مند ہونا لازمی ہے۔

ایک قدیم محقق نے لکھا ہے کہ باتھ روم میں گانے کا رواج برطانیہ سے شروع ہوا تھا۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ برطانیہ کے باشندے جس کا آغاز کریں، ہم اسے اپنی زندگی کا لازمی حصہ بنا لیتے ہیں۔ برطانیہ کے دیہات میں رہنے والا بھی شہری ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں کی بات ہے کہ ایک برطانوی شہری کے باتھ روم کا دروازہ ٹوٹ گیا۔ اس نے دروازہ مرمت کرنے یا نیا لگانے کی بجائے باتھ روم کے صدر دروازے پر موٹے کپڑے کا ایک پردہ لٹکا لیا۔ اب پردے پر کنڈی لگانا ناممکن تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر کوئی نامعقول، دخل در معقولات کا مرتکب ہو گیا تو خوامخواہ میری بے عزتی خراب ہونے کا احتمال ہے۔ کسی دوسرے کو کیا خبر کہ میں باتھ روم میں نہا رہا ہوں۔ اس نے کافی سوچ بچار کے بعد اس کا حل نکال لیا۔ اب وہ باتھ روم میں گھستے ہی گانا شروع کر دیتا تا کہ دوسروں کا احساس دلا سکے کہ وہ باتھ روم کے اندر ہی موجود ہے۔ اس کا یہ معمول اتنا مقبول ہوا کہ جس دن اس کے گانے کی آواز نہ آتی، پڑوسی سمجھ جاتے کہ آج اس نے نہانے سے احتراز فرمایا ہے۔ روزانہ ہی باتھ روم میں ریاض کرنے کے بعد وہ ایک سریلا سنگر بن گیا۔ اب اس نے ملازمت کو لات ماری اور کل وقتی سنگر کے طور پر متعارف ہوا۔ اس طرح باتھ روم سنگنگ کا آغاز ہو گیا۔ وہ سنگر بے چارہ تو اپنی موت آپ مر گیا لیکن اس کا ایجاد کردہ فن آج تک زندہ ہے۔

آج کل سنگرز کا ایک نیا قبیل کافی مقبول ہو رہا ہے۔ ان سنگرز کو عرفِ عام میں پاپ سنگر کہا جاتا ہے۔ ہم ان کو

استفسارات وجوابات

سوال: مجھے جس لڑکی سے محبت ہے وہ حسین ہونے کے علاوہ انٹیلیکچو ل بھی ہے۔ میں "ڈاکٹر" ہوں اس لیے علم و ادب میں دلچسپی رکھنے کی قطعاً فرصت نہیں۔ ابھی تک پیغام نہیں بھجوایا کیوں کہ میرے خیال میں وہ ولی دکنی، ہربٹ سپینسر، ابونواس اور بھرتری ہری کے جانب مائل ہے، جب کبھی اس سے ملتا ہوں، یہی نام سننے میں آتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟ آپ کے مشورے کا منتظر ہوں۔

جواب: ہمارے خیال میں آپ کو فوراً پیغام بھیجنا چاہیئے، اتنے حضرات کی موجودگی میں ذرا سی دیر بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر شفیق الرحمان

باتھ روم سنگر کہنے کا پاپ نہیں کر سکتے کیونکہ اگر اِن کو باتھ روم میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع دیا جائے تو باتھ روم کے درودیوار سلامت رہنے کی ضمانت کون دے گا؟ گانے کی اِس طرز میں گانا کم اور چلاّنا زیادہ پڑتا ہے، جو زیادہ زور سے چلاّنے میں کامیاب ہو جائے وہی مقبولیت کا حدوں کو چُھو سکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاپ سنگر اکثر اسٹیڈیم میں اپنے فن کا لوہا منواتا ہے۔ گانے کا مظاہرہ شروع کرنے سے پہلے اسٹیڈیم کے تمام دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں کیونکہ پاپ سنگر کے فن کا لوہا بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد سامعین کے سروں پر لوہے کے ہتھوڑے کی طرح برسنا شروع کر دیتا ہے۔ ان حالات میں سامعین کے بھاگنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اسٹیڈیم کے دروازے بند کیے جاتے ہیں۔ دراصل اسٹیڈیم جیسی کھلی فضا ہی پاپ سنگر کے فن کی متحمل ہو سکتی ہے۔ شنید ہے کہ جس اسٹیڈیم میں پاپ گانے کی گونج سنائی دے، پرندے بھی دہشت زدہ ہو کر اس اسٹیڈیم کے اوپر پرواز کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

کلاسیکل سنگر کو باتھ روم سنگرز کی صف میں شامل کرنا توہین آمیز ہوتا ہے، کلاسیکل سنگرز بے چارے تو برسوں کی ریاضت اور فن گائیکی کے رموز سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ان کا فن سینہ بہ سینہ اور طبلہ بہ طبلہ سفر کرنے کے بعد پرانی نسل سے نئی نسل میں منتقل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گانے سے پہلے سامعین پر سکّہ جمانے کے لئے اپنے گھرانے کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ فوک سنگر کو آپ باتھ روم سنگر کی فہرست میں نہیں لا سکتے کیونکہ وہ زیادہ تر میلوں ٹھیلوں میں اپنے فن کا جادو جگاتے ہیں۔ اُن کی آواز میں ایسا جادو ہوتا ہے کی اسے سن کر لوگ باتھ روم جانا بھول جاتے ہیں۔ ویسے بھی میلوں ٹھیلوں میں باتھ روم ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ فوک سنگر کو باتھ روم سنگر کہنے کی بجائے آپ اُن کو کچن سنگر کے نام سے پکار سکتے ہیں کیونکہ کچھ فوک سنگر اپنے گانے سے زیادہ اپنے ہاتھ میں پکڑے چمٹے کی وجہ سے مشہور ہوتے ہیں۔ اس بات پر کسی کو اختلاف نہیں کہ چمٹا چولھے میں آگ جلانے کے لئے مددگار کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اگر کوئی چمٹے کو میوزیکل انسٹرومنٹ کے طور پر استعمال کرنے پر بضد ہو تو اس میں چمٹے کا کیا قصور ہے؟

ایک دفعہ گانے کے مقابلے میں ایک سنگر نے عجیب وغریب شرط پیش کر کے منتظمین کو ورطہ ءِ حیرت میں ڈال دیا۔ اُس نے گانے سے پہلے اسٹیج پر باتھ روم بنانے کی شرط پیش کر دی۔ منتظمین نے جب اُس سے باتھ روم کے پیچھے چھپی منطق دریافت کی تو اُس نے نہایت سادہ دلی سے اظہار کیا کہ میں دراصل

باتھ روم سنگر ہوں اور میرا اگلا باتھ روم میں ہی کُھلتا ہے۔ اگر میں باتھ روم سے باہر سُر لگانے کی کوشش کروں تو میری آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اس مقابلے کے جج ایک معروف سنگر نے مسئلہ کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسٹیج پر ایک عارضی باتھ روم بنانے کی اجازت دے دی۔ حیرت کی بات ہے کہ باتھ روم سنگر نے وہ مقابلہ آسانی سے جیت لیا۔ بعض دوسرے سنگرز کا الزام تھا کہ فاتح سنگر نے باتھ روم میں جا کر گانا نہیں گایا بلکہ جدید سسٹم سے آراستہ موبائل پر پاپولر سنگر کا گانا پلے کر دیا تھا۔ اس طرح وہ باآسانی مقابلہ جیت گیا تھا۔

شوکت علی مظفر

لال بجھکڑ لال قلعہ میں

ایک پہلوان ایک وقت میں ۸۰ روٹیاں کھاتا تھا۔ سرکس والوں نے اسے دیکھا تو منہ مانگی رقم دے کر سرکس میں یہی کام کرنے پر راضی کرلیا۔ پہلا شو شروع ہوا، پہلوان نے ۸۰ روٹیاں کھالیں۔ اگلا شو ایک گھنٹے بعد شروع ہوا پہلوان نے پھر اسی تعداد میں روٹیاں کھالیں۔ تیسرے شو میں اور زیادہ عوام کا رَش ہوگیا لیکن جب پہلوان کی باری آئی تو وہ غائب ہوگیا۔ سرکس کے منتظمین اسے ڈھونڈتے ہوئے جب اس کے گھر پہنچے تو وہ بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ جب اُس سے غائب ہونے کی وجہ پوچھی تو پہلوان نے کہا ''اب میں کھانا بھی نہ کھاؤں، کیا سارا دن نوکری ہی کرتا رہوں گا۔''

یہ قصہ ہمیں عین اس وقت یاد آیا جب ایم آئی ایس اسٹوڈیو کے جملہ ارکان لال قلعہ نامی ریسٹورنٹ میں بیٹھے ''نوکری'' کر رہے تھے۔ دو گھنٹے کا وقت مخصوص تھا اور اس دوران مختلف اقسام کے کھانے تھے جو تازہ تازہ بھاپ اُڑاتے پیش کیے جا رہے تھے۔ زیادہ نہیں چند ماہ پہلے کی بات ہے، ہماری خوراک انتہائی کم تھی، اتنی کہ دوپہر میں کھالیا تو اگلے دن ناشتہ ہی کرتے تھے۔ مگر اسٹوڈیو کے گرافک ڈیزائنر آصف جوسی ڈیز کے گورز اور دیگر گرافکس بنانے کے ماہر ہیں، نے ہاضمے کے چورن اور دیگر فارمولے ہم پر ٹرائی کر کے ہمیں بھی ''چھوٹا پہلوان'' بنادیا ہے۔ یہاں بھی آصف نے کھڑے ہوکر اعلان کیا ''دومنٹ کی توجہ بڑی مہربانی! کسی صاحب کو ہاضمے کا چورن چاہیے ہو تو مجھ سے رابطہ کریں۔''

آج کی دعوت ۲۳ مارچ ۲۰۱۵ء کے روز ایم آئی ایس اسٹوڈیو کے زیرِ اہتمام ہونے والے بچوں کے مقابلہ مصوری (اسلامی و پاکستانی ثقافت) میں خدمات انجام دینے والے ساتھیوں اور خاص طور پر ''لال بجھکڑ'' کے اعزاز میں تھی۔

لال بجھکڑ بچوں کا پسندیدہ کارٹون کریکٹر ہے اور اس کا اسکرپٹ لکھنے کی ذمہ داری اب تک ہم ہی نبھاتے رہے ہیں۔ مقابلہ مصوری میں لال بجھکڑ کی بھی خصوصی آمد تھی، انہوں نے بچوں کو آٹو گراف بھی دینے تھے اور اپنی حرکتوں سے بچوں کو محظوظ بھی کرنا تھا۔ اس کے لیے جس دوست کا انتخاب کیا گیا وہ انتہائی حد تک سنجیدہ اور غصے والے ہیں لیکن بچوں کی خاطر انہوں نے یہ ذمہ دار بخوشی اپنے ذمہ لے لی۔ مقابلہ مصوری میں حصہ لینے والے ۱۳۰ بچے، پھر ان بچوں کے بہن بھائی اور والدین، غرض بڑی تعداد میں شرکاء کے سامنے لال بجھکڑ کا کردار نبھانا کوئی آسان کام نہ تھا

اور اس شخص کے لیے جس کا ان چیزوں سے واسطہ بھی نہ ہو۔ بہر حال ہم نے انہیں بڑی محنت سے تیار کیا اور انہیں دیکھ کر سب سے پہلے ہمیں ہی ہنسی آگئی اور اس وقت تو صورتحال اور بھی مضحکہ خیز تھی جب یہ اسی کارٹون حلیے میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے ہال تک پہنچے تھے۔ لوگ انہیں دیکھنے کے لیے رک جاتے اور حیرت سے منہ کھولے سوچنے لگتے، شاید کوئی خلائی مخلوق اتر آئی ہے۔

مقابلہ مصوری ہو اور لال بجھکڑ حصہ نہ لیں یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اُنہوں نے بھی بھرپور طریقے سے بچوں کو آٹوگراف دیئے پھر خود بھی مقابلے میں کود گئے۔ میزبان نے انہیں اسی جگہ دیکھا جہاں بچے اپنے فن پاروں کو مکمل کر رہے تھے تو اس طرح کی بات چیت ہوئی:

میزبان: ''ارے بھئی! آپ یہاں کہاں آگئے؟''

لال بجھکڑ: ''آج مصوری کا مقابلہ ہے نا؟''

میزبان: ''تو پھر!''

لال بجھکڑ: ''میں نے بھی حصہ لیا ہے۔''

میزبان: ''لیکن سر بکرا عید تو ابھی بہت دور ہے، اتنی جلدی گائے کی قربانی میں حصہ ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟''

لال بجھکڑ: ''میں نے قربانی کے حصے کی نہیں مصوری کے مقابلے میں حصہ لینے کی بات کی ہے۔''

میزبان: ''لیکن سر! آپ کو مصوری کی الف ب بھی معلوم نہیں۔''

لال بجھکڑ: ''ارے نالائق! تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں! مصوری میں الف ب نہیں رنگ اور برش ہوتا ہے۔''

میزبان: ''وہی تو سر! آپ کیسے مصوری کریں گے، آپ کو برش پکڑنے بھی نہیں آتا۔''

لال بجھکڑ: ''کیوں نہیں آتا برش پکڑنا...... روزانہ صبح صبح برش سے ہی تو دانتوں کو صاف کرتا ہوں۔''

(جیب سے بڑا سا دانتوں کا برش نکال کر فخر سے اس کی نمائش کی)

میزبان: ''سر! دانت صاف کرنے کا برش الگ ہوتا ہے اور مصوری کا الگ۔''

لال بجھکڑ: ''بھئی! مصوری کے برش سے تو ہر کوئی تصویر بنا لیتا ہے، میں نے تو دانت صاف کرنے والے برش سے تصویر بنائی ہے۔''

میزبان: ''سر آپ نے دانتوں والے برش سے واٹر کلر کیسے بھر لیا؟''

لال بجھکڑ: ''میں نے صرف واٹر سے تصویر بنائی ہے، کلر سے اگلی مرتبہ بناؤں گا۔''

میزبان: ''دکھائیں سر کیا بنایا ہے؟''

(لال بجھکڑ نے میزبان کو اپنی بڑی سے ٹوپی اتارنے کا کہا، اس میں سے ایک مڑا تڑا سا کاغذ نکلا، لال بجھکڑ نے اشارے سے بتایا کہ یہ میری بنائی ہوئی پینٹنگ ہے، میزبان نے کاغذ کو کھول کر دیکھا تو بالکل صاف تھا)

میزبان: ''سر! یہ تو بالکل خالی ہے، آپ نے کس چیز کی تصویر بنائی تھی؟''

لال بجھکڑ: ''میں نے شاہی سواری یعنی اپنے گدھے کو گھاس کھاتے ہوئے دکھایا ہے۔''

میزبان: ''مگر سر! تصویر میں تو گھاس ہے ہی نہیں۔''

لال بجھکڑ: ''نالائق! گھاس کہاں سی ہوگی، وہ تو شاہی سواری کھا گئی ہے۔''

میزبان: ''لیکن سر...... شاہی سواری تو کہیں نظر نہیں آرہی۔''

لال بجھکڑ: ''پتہ نہیں تم میں کب عقل آئے گی...... ارے بھئی! جب شاہی سواری نے گھاس کھالی ہے تو وہ یہاں کس لیے رکے گی، اسی لیے وہ بھی چلا گئی ہے۔''

میزبان: ''ہیں......!!''

جلد ہی مقابلہ مصوری کا اعلان ہونے لگا اور تین بچوں نے خوبصورت فن پارے تیار کرنے پر پانچ سو، تین سو اور دو سو ریال کا نقد اور مختلف کتابوں پر مشتمل انعام جیت لیا۔ اول و دوم بچے تھے

اور تیسرے نمبر پر بجی رہی۔ لال بجھکڑ ناراض ہوتے رہے کہ انہیں کوئی انعام نہیں دیا گیا حالانکہ انہوں نے اتنی اچھی پینٹنگ کی تھی۔ یہی وجہ تھی جو اِن کے اعزاز میں تقریب کا پروگرام بنایا گیا اور یہ ضد پر اَڑ گئے کہ میرا نام لال بجھکڑ ہے اور میں "لال قلعہ" کے علاوہ کہیں نہیں جاؤں گا۔ یہاں پہنچے تو ہمیں بڑے اہتمام کے ساتھ اس ریسٹورنٹ کے کچن، اسٹور روم، کولڈ روم اور لیبارٹری میں بھی خصوصی دورے پر لے جایا گیا کہ کھانوں کے معیار کو کس طرح برقرار رکھا جاتا ہے۔

چکن ونگز کی شکل کی کوئی چیز تھی جسے لال بجھکڑ اٹھانے ہی والے تھے کہ ہماری نظر اس کے نام پر پڑ گئی، ہم نے فوراً کہا "یہ جھینگا ہے" لال بجھکڑ نے ہاتھ اس طرح ہٹایا جیسے ہم نے مگر مچھ کہہ دیا ہو جو ان کے ہاتھ کو کھا جائے گا۔ دو گھنٹے ہونے والے تھے، وقت ختم ہو رہا تھا اس لیے تمام شرکاء ▯ آئسکریم پر ٹوٹے ہوئے تھے۔ یہاں مبشر خان پریشان بیٹھا ہے کہ سب کچھ تو ہے لیکن نہاری نہ ہونے سے مزا نہیں آ رہا۔ ہم نے لال بجھکڑ کو دیکھا تو وہ غائب تھے، انہیں بھی ڈھونڈا گیا تو ایک گوشے میں بیٹھے ملے، گھڑی ان کے سامنے رکھی تھی اور حلیم کی پلیٹ ہاتھ میں۔ جلدی جلدی ہاتھ چلا رہے تھے۔ وجہ پوچھی تو فرمایا "یہاں ایک ایک منٹ قیمتی ہے، ابھی آٹھ منٹ رہتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی منٹ ضائع ہو۔"

واقعی لال بجھکڑ نے اس کے بعد سبز چائے کا آخری گھونٹ بھرا تو ٹائم برابر ہو چکا تھا اور باہر سے کسی شاہی سواری کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی لیکن ہم سوچ رہے تھے کہ آگر آصف کے پاس لکڑ ہضم پتھر ہضم کا چورن ہے تو "بڑے آصف" کے پاس کون سا فارمولا ہوگا جس کے استعمال سے ڈکار تک نہیں آتی اور سب کچھ خاموشی سے ہضم بھی ہو جاتا ہے!!

جھوٹ

(قطعہ باتصویر)

مشینوں سے ہم ویٹ کرتے تو ہیں
مگر ایسی حرفت کسے سُوٹ ہے
مرا وزن اِتنا بھی ممکن نہیں
نِرا جھوٹ ہے یہ نِرا جھوٹ ہے

نوید ظفر کیانی

عبد الجبار قیصرانی بلوچ

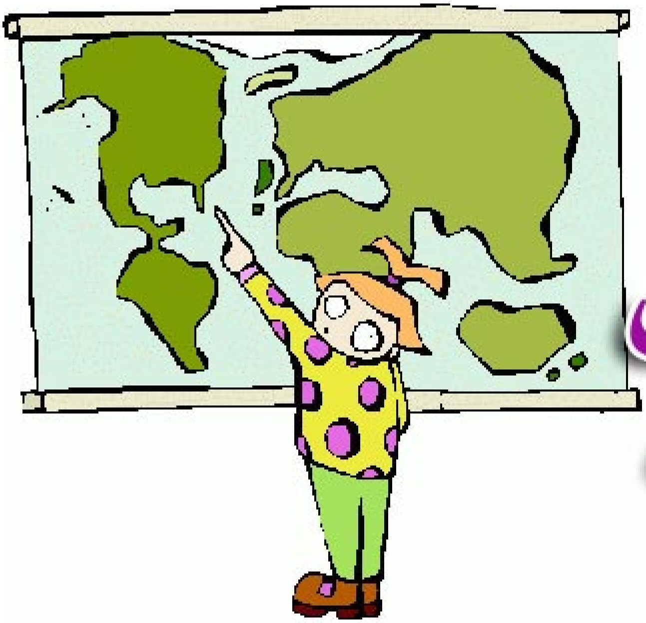

تونسہ شریف کا جغرافیہ

پطرس بخاری اس دنیا میں نہیں رہے ورنہ وہ لاہور کی طرح تونسہ کا جغرافیہ ضرور لکھتے اور اس پر وہ ادب کا نوبل پرائز ضرور حاصل کرتے۔ اُن کا یہ کام ادب کی صفوں میں ایک شہکار کام سمجھا جاتا۔ بس اجل نے انہیں مہلت نہیں دی سو ہم نے ان کا ادھورا کام پورا کرنے کا پروگرام بنایا۔ تونسہ کے لالہ زاروں کی حالت زار کا نوحہ میر انیس ضرور لکھتے۔ احمد فراز نے جنوبی پنجاب کا استحصال کیا ورنہ وہ جاناں جاناں کے نام سے ایک غزل تحصیل تونسہ کے نام بھی کرتے۔

تونسہ کا محل وقوع کچھ یوں ہے کہ ایک ایمبولینس کا اہتمام کریں اس کے اندر ایسا مریض ڈالیں جس پر نزع کا عالم ہو۔ جہاں وہ چیخ اٹھے کہ زندہ ہوں ابھی نہ دفناؤ مجھے تو آپ سمجھ لینا کہ اب تونسہ آ گیا ہے۔ یا ایمبولینس کے پرزہ پرزہ فرطِ مسرت سے الگ ہو جائے تو سمجھ لینے کہ آپ تونسہ کی گلیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اگر اس پر بھی آپ مطمئن نہ ہوں تو دیکھنا جس شہر میں ایک گلی کے اندر آپ کو لامحدود تعلیم کی دوکانیں نظر آئیں تو آپ کے ذہن میں آ جانا چاہیے کہ اب آپ تونسہ شریف کے اندر داخل ہو چکے ہیں۔

تونسہ شریف کا حدود اربعہ نہایت ہی آسان ہے۔ آپ بذات خود تونسہ شریف کا نقشہ دیکھ کر گلوب بنا سکتے ہیں۔ اس کے جنوب میں پاکستان کا وہ دریا بہتا ہے جسکا تذکرہ جنوبی پنجاب کا استحصال کرنے والے مورخ حضرات نے نہیں لکھا وہ ہے دریائے سنگھڑ جو پورے زور شور کے ساتھ سیوریج کے پانی سے رینگتا رہتا ہے۔ اس سے مختلف کھیتوں کو سیراب کیا جاتا ہے۔ جہاں پر تازہ سبزیاں اگتی ہیں۔ اس کے شمال میں غالب خیال کے مطابق شمال ہی پایا جاتا ہے کیونکہ یہاں داخل ہو کر انسان کا اپنا جغرافیہ خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسے پتہ نہیں چل رہا ہوتا ہے۔ اس کے مغرب میں ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ شہر تونسہ سے آنے والی سڑک ہے۔ اس کے مشرق میں کوئی خاص علاقہ نہیں ہے کیونکہ اس کے مکین یا تو سیلاب زدہ ہوتے ہیں یا شادی شدہ ہوتے ہیں۔

تونسہ شریف کی آب و ہوا ڈینگی کے لیے مفر ملیریا کے لیے سازگار اور صحت کے لیے قدرے ناخوشگوار ہے۔ یہاں پر زندگی سے مایوس افراد تشریف لاتے ہیں اور زندگی سے شفا یاب ہو کر قبروں کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ اگر انسان ہوا خوری کے لیے صبح صبح کسی باغ کا رخ کرے تو وہاں پر کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے اٹھتی ہوئی خوشبو استقبال کرتی ہے۔ یہاں پر پانی کا مسئلہ کمیٹی نے حل کیا ہوا ہے۔ واٹر سپلائی کی لائینوں کو سیوریج کے ساتھ جوڑ کر تونسہ شریف کے مکینوں کو تازہ اور جراثیم زدہ صحت نام سے پاک پانی

مہیا کیا۔ کبھی کبھی مکین بلبلاتے ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ گرمیوں میں پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ اِس کے حل کیلئے مکینوں نے تو کوئی عرضی نہیں دی مگر کمیٹی کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اس لیے اس نے یہ مسئلہ بھی حل کرانے کی یقین دہانی کروائی ہے۔

یہاں پر صفائی کا نہایت اعلیٰ نظام ہے گندگی کا نام و نشان تک نہیں ہے کیونکہ گندگی اِتنی ہے کہ صفائی کا سراغ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ ایک دفعہ ابرِ کرم خوب برسا تو ہم محلے سے کشتی رانی کے ذریعے اے سی صاحب جناب عباس کاٹھیا کے پاس گئے تو موصوف نے ہمارا ہاتھ پکڑا اور ہمیں اپنے گھر لے گئے تو وہاں پر سیلاب کا منظر دیکھ کر ہم آب دیدہ ہو گئے۔ اور عرض کی حضور ہمیں آپ کی حالت زار کا پتہ نہیں تھے و گرنہ ہم آپ کے ہاں آتے ہی ناں۔ ہم اس لمحے اپنے دکھ درد بھول گئے اور کہا جناب ہم آپ کی اس حالتِ زار کا تذکرہ اعلیٰ حکام سے ضرور کریں گے۔ بعد میں شاید وہ دل برداشتہ ہو کر چلے گئے۔ اب جا کے کوئی انہیں بتائے تونسہ میں صفائی کا اتنا اعلیٰ معیار ہے کہ ہر سو گندگی ہی گندگی ہے۔ ابلتے گٹر، کھلے ہوئے مین ہول انسانی جانوں کو راہِ عدم دکھا رہے ہیں۔ لوگ ایسے موقعوں پر بد دعا دے کر دوبارہ ووٹ اپنے پیاروں کو ہی ڈالتے ہیں۔

ہر شے اعلیٰ ہے۔ یہاں کے سیاستدان بھی فہم و فراست سے سیاست کرتے ہیں۔ وہ سیاست میں بدمعاشی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ صرف ہر ماہ اپنے چار پانچ نافرمانوں کو حوالات کے اندر دعوت پر مدعو کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور نظام بھی ہے سیاستدان الیکشن کے دنوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ صرف چند لوگوں کو جیل میں بھیج کر یہ بتا دیتے ہیں کہ جناب الیکشن آنے والا ہے۔ سیاستدان ایک دوسرے کے اوپر کیچڑ نہیں اچھالتے بلکہ اپنے حلقۂ انتخاب میں صفائی کا معیار اتنا اعلیٰ رکھتے ہیں کہ کیچڑ اچھل کر مخالف فریق کے کپڑوں پر جا چپکتا ہے۔ یہاں شفاف الیکشن ہوتے ہیں۔ ہر سیاستدان اپنے گھر کے پولنگ سٹیشن پر صرف دس پندرہ ہزار ووٹ اضافی ڈالتا ہے۔ یہاں سیاستدان ایک دوسرے سے انتقام نہیں لیتے۔ صرف مخالف ووٹروں کو تھانہ کچہری کے چکروں میں پھنساتے ہیں۔ مدبرانہ سیاست مفاہمانہ سیاست کو یہاں پر عروج ہے۔ کیونکہ سیاست دان اپنے مخالف کی راہ روکنے کے لیے کسی بھی وقت کسی بھی پارٹی منشور کو اپنا اور ٹھکرا سکتا ہے اور کسی پر لوٹا ہونے کا الزام اِس لیے نہیں آتا کیونکہ تونسہ شریف کے اندر کمہار برادری نے واضح کہا ہوا ہے کہ ہمارے فنِ کوزہ گری کی تضحیک نہ کی جائے اور ہمارے فن کا تمسخر نہ اڑا جائے۔ ہم یہ کسی صورت برداشت نہیں کریں گے۔

سیاستدان بھی کمال کے سیاستدان ہیں کیونکہ وہ کرپشن بالکل نہیں کرتے۔ اگر کرپشن کرتے بھی ہیں تو چار پانچ ارب کی۔ یہ تو مناسب بھی ہے اور سیاست میں جائز بھی ہے۔ کیونکہ اِتنا حق تو انہیں بھی حاصل ہونا چاہیے۔ یہاں کے سیاستدانوں سے حکام اعلیٰ کو کوئی شکایت نہیں ہے۔ اگر شکایت پیدا ہو بھی جائے تو چائے پانی کے پیسے دے کر انہیں راضی کر لیا جاتا ہے۔۔ یہاں کے سیاستدانوں کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ اسمبلی کے ایوانوں میں جا کر چپ کا روزہ رکھ لیتے ہیں اور واپسی پر آ کر کبھی کبھار دوستوں کی محفل میں افطاری کرتے ہیں ورنہ وہ صدقِ دِل سے یہی سمجھتے ہیں ایک چپ سو سکھ۔

ترقیاتی کاموں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ اگر آپ اس کا عملی مظاہرہ دیکھنا چاہتے ہیں تو کسی روز چھٹی کے وقت جا کر دیکھیں اور آپ محسوس کریں گے کہ آپ واقعی جال میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنا محال ہے۔ حالیہ ترقیاتی بجٹ میں ایک گرانٹ کو کلمہ چوک سے کچہری چوک تک روڈ کی تعمیر کے لیے صرف کیا گیا ہے۔ جہاں پر کوہ قاف کے مزدوروں نے حصہ لیا اور ایسا شاہکار روڈ بنایا کہ جگہ جگہ خوبصورت گڑھے بن گئے۔ ترقیاتی کاموں کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ الیکشن کے ہفتہ بعد دن دیہاڑے موٹر سائیکل روڈ پر انتہائی لاڈ و پیار سے چھینا گیا۔

تونسہ شریف کے اندر ایک اعلیٰ پائے کے ہسپتال کو تو ہم بھول ہی گئے۔ جہاں پر متعین تمام ڈاکٹر حضرات پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے مریضوں کا علاج پرائیوٹ کلینک میں کر رہے ہیں۔ جہاں پر واش روم بہت ہی اعلیٰ پائے کے ہیں، بس پانی کا نظام

محبت

ملک صاحب کو اُردو سے بہت محبت ہے، اس لیے کم ہی اس پر توجہ دی۔ بولتے ہیں، محبوب پر زیادہ توجہ دو تو وہ نخرے دکھانے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ شگفتہ و شائستہ تحریر کا مطلب بھی اپنے شاگردوں کو شگفتہ اور شائستہ کے نازک ہاتھوں سے لکھی ہوئی تحریر بتاتے ہیں۔

شوکت علی مظفر

اگلی صدی تک ہو جائے گا۔ اس ہسپتال سے مریضوں کو مفت بیماریاں بانٹی جاتی ہیں۔ کیونکہ سرکاری ادویہ تو میڈیکل سٹوروں میں اڑ کر پہنچ جاتی ہیں۔ تمام ڈاکٹر حضرات سیاسی دباؤ سے بالاتر ہو کر کسی بھی مریض کا آپریشن نہیں کرتے کیونکہ کسی کا آپریشن کرنا وہ بھی سرکاری ہسپتال میں، قطعاً مناسب کام نہیں۔۔

یہاں پر تعلیمی معیار بہت ہی بلند ہے۔ معلم حضرات صرف اپنی فیس لے کر طلبہ کو کالج کے اوقات میں کالج کے اندر تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کسی قسم کی داخلہ فیس نہیں لیتے اور سال کے بعد بورڈ لگا دیتے ہیں کہ دس ہونہار طلبہ نے اسی پرسنٹ نمبر حاصل کیے اور باقی پچاس کے متعلق ٹیچر بھی خاموش، ادارے بھی خاموش۔ کیونکہ وہ سیکنڈ ڈویژن سے پاس ہوئے ہیں۔ آخر اس میں استاد کا کیا قصور وہ بھی آٹھ آٹھ جگہوں پر ٹیوشن پڑھتے تو آج یہ حال نہ ہوتا۔ اُنھیں کوئی کیسے سمجھائے کہ پاکستان میں سرکاری ادارے صرف جاب کے لیے ہوتے ہیں۔ باقی سب معاملات پرائیوٹ اداروں میں۔

تونسہ شریف کے اندر لاہور کے جغرافیہ سے مختلف، طلبہ کی کئی اقسام ہیں:

☆ پہلی اقسام ان طلبہ کی ہے جو عاشق مزاج ہیں۔ عشق کا اظہار نہیں کر پاتے۔ صرف حسرتِ دیدار دل میں لیے گلی کوچوں میں آوارہ گھومتے نظر آتے ہیں۔ یہ نہایت ہی دُکھی ہوتے ہیں۔ محبوب کو گالیاں بھی دیتے ہیں اور دعا بھی کرتے ہیں۔ محبوب کی خیر خبر رکھتے ہیں۔ مگر محبوب سے چھیڑ خانی نہیں کرتے۔ کیونکہ محبوب بھی تو ہزاروں کا محبوب ہوتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ کسی گلی میں اُن کی زندگی کی شام ہو جائے۔

☆ دوسری قسم ان طلبہ کی ہے جو لڑکیوں کی متاثر کرنے کے چکروں میں مضحکہ خیز لباس پہنتے ہیں اور بیرون ملک جانے کے لیے پاسپورٹ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ یا ہر وقت اعلیٰ تعلیمی اداروں کا پمفلٹ پڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بیچارے شوخے آجکل نایاب ہو رہے ہیں۔ کیونکہ ڈی ایس پی نے بروقت ڈی ڈی ٹی کا استعمال کیا اور اس نسل کو معدوم کر دیا۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے اعلیٰ حکام سے سفارش کی کہ وہ ڈی ایس پی کے خلاف ایکشن لیں اور ٹرانسفر کر دیں وگرنہ یہ نسل معدوم ہو جائے گی۔

☆ تیسری قسم کے طلبہ وہ ہیں جن کی طبیعت بدمعاشی پر مائل ہے۔ مگر ان راہوں میں آجکل ڈی ایس پی حائل ہے۔ سو یہ اپنے ساتھ چار پانچ عاشق رکھتے ہیں۔ تاکہ بروقت شکار کو ہراساں کیا جائے۔ یہ نسل اکثر کالجوں کی چار دیواری پھلانگتے ہوئے نظر آئے گی۔ یا کسی کو دھمکاتے ڈراتے نظر آئے گی

☆ چوتھی قسم کے وہ طلبہ ہیں جنھیں یہ فکر دامن گیر رہتی ہے۔ کوئی نظرِ کرم ان پر بھی آ کر رکے۔ کوئی اُن کا بھی رُخِ انور دیکھے۔ مگر ایں خیال است محال است وجنوں کے مصداق وہ اِن سب باتوں سے محروم ہی رہتے ہیں۔ یہ حجاموں کے پاس جاتے ہیں تراش خراش کے لیے۔۔۔ مگر پھر بھی کچھ کام نہیں بنتا۔ اور اِس بات کا رونا دھونا وہ ساری زندگی روتے ہیں۔

☆ پانچویں قسم کے وہ طلبہ ہیں جنھیں شادی سے پہلے شادی کی فکر ہوتی ہے۔ وہ دلائل سے ماں باپ کو شادی کی فضیلتوں کی اہمیت اجاگر کرتے ہیں مگر ماں باپ کے لیے یہ سب اچنبھے کی باتیں نہیں ہوتیں وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور ایسی باتوں پر موضوع تبدیل کر دیتے ہیں

☆ آوارہ قسم کے طلبہ، یہ آوارہ نہیں ہوتے۔ بس ماں باپ کی حلال کمائی کو نشہ چرس میں صرف کرتے ہیں اور "جہاں کی کمائی وہاں لگائی" والی کہاوت کا کما حقہ حق ادا کر دیتے ہیں۔

نادر خان سرگروہ

جاہِ جائے

ایک شام ۔۔۔۔ چائے پر ہمارے ایک دوست کالی چائے کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے کہ اِس کے پینے سے ''یہ'' فائدے ہوتے ہیں اور ''وہ'' نقصانات نہیں ہوتے۔ اُنھوں نے آسٹریلیا میں کی گئی ایک ریسرچ کا حوالہ بھی دیا۔ جس کے مطابق، دن میں کم از کم تین پیالی کالی چائے پینے کا مفت مشورہ دیا گیا ہے۔ وہ جس انداز میں کالی چائے کی نہر پر تعریفوں کے پُل باندھ رہے تھے، ہمیں شبہ ہونے لگا کہ کہیں وہ دودھ کے جلے نہ ہوں۔ وجہ جو بھی ہو، ہمیں اِن کی چائے میں کچھ کالا نظر آیا۔ اب تک تو ہم سبز چائے (Green tea) کے متعلق سنتے آئے تھے کہ بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کو کنٹرول کرتی ہے۔ ہارٹ اَٹیک کے خطرے سے محفوظ رکھتی ہے۔ لیکن یہ کالی چائے کی تعریف؟...... حلق سے نہیں اترتی۔

بڑے شہروں اور اُس کے اَطراف میں رہنے والے لوگ جب تک چائے سے اپنا منہ نہ جلالیں، اُن کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ بلکہ بعضوں کو تو ہر گھنٹے آنکھیں کھولنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ وہ رات گئے آنکھیں بند ہونے تک چائے پی پی کر آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ بیڈ ٹی (Bed tea) کے بھی عادی ہوتے ہیں۔ ہمارے دوست پُر جوش پوری اپنی اصطلاح میں اِسے ویری بیڈ ٹی (Very bad tea) کہتے ہیں۔ اِن بیڈ (ٹی) بائز کا بس چلے تو خوابوں میں بھی چائے کا شوق پُورا کریں۔ یعنی آنکھ کھُلنے سے پہلے ۔۔۔۔ ڈریم ٹی (Dream tea)۔ جب ایسے لوگوں سے منہ دھونے کو کہو تو نہار منہ یہ جواب دیتے ہیں، ''شیر کبھی منہ نہیں دھوتے۔'' ہم کہتے ہیں، شیر تو کیا؟ ۔۔۔۔ گدھے بھی منہ نہیں دھوتے۔

شہروں کے بیشتر لوگ؛ چھوٹے ہوں کہ بڑے ۔۔۔۔ سب اپنے دن کی شروعات صرف چائے سے ہی کرتے ہیں جب کہ غیر اہم سمجھے جانے والے بہت سے اہم کام، صبح سے لے کر دوپہر تک ہی کیے جاتے ہیں۔ اسکول کی پڑھائی، کاروبار، حساب کتاب، لمبی لمبی قطاروں میں طویل انتظار، ٹرینوں اور بسوں کے دھکے، گالم گلوج، ہاتھا پائی ۔۔۔۔ سب کچھ ایک چائے کی پیالی کے سہارے سہارے ہی ہوتا

ہے۔

چائے اور دودھ کا کم از کم برصغیر میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔(چولی دامن جیسی مثال برصغیر کے علاوہ اور کہاں) بھلے ہی دودھ میں دودھ نہ ہو، چائے میں دودھ ہونا چاہیے۔دودھ کے ساتھ چائے پکانے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اُس میں چائے کا انتظار طویل ہو جاتا ہے۔یعنی چائے کے مزے میں انتظار کا مزہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔

چائے اور پانی کا بھی اٹوٹ بندھن ہے۔پانی کے بغیر چائے ۔۔۔ چائے نہیں۔ اور 'چائے پانی' کے بغیر تو دُنیا کے کام بھی آگے نہیں بڑھتے۔ چائے اور Cookery (کھانا پکانے کی ترکیب) کا بھی عجیب تعلق ہے۔تیکھا ہو کہ میٹھا، کوئی پکوان ایسا نہیں ہوتا، جس میں چائے کے چمچے نہیں ڈالے جاتے۔ وہ اس طرح کہ:

لال مرچ ۔۔۔ایک چائے کا چمچہ

زیرہ پاؤڈر۔۔۔دو چائے کے چمچے

کھانے کا سوڈا۔۔۔ایک چائے کا چمچہ

حکیمی نسخے بھی تولہ تولہ اور ماشہ ماشہ...... کوٹ کوٹ کر بڑی محنت سے تیار کیے جاتے ہیں، پھر کہا جاتا ہے،''صبح ایک چائے کا چمچہ اور شام دو چائے کے چمچے۔''

صبح کی چائے اور اخبار میں بھی کھٹا میٹھا رشتہ ہے۔اخبار کے ساتھ چائے پینے کا یہ فائدہ ہے کہ اگر چائے ضرورت سے زیادہ میٹھی ہو تو اخبار اُس کی مٹھاس کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔چائے سے آنکھ کُھلے نہ کُھلے اخبار کی سُرخیوں سے کھل جاتی ہے، بلکہ سرخی اخبار بین کی آنکھوں میں اُتر آتی ہے اور اُسے افسوس ہوتا ہے کہ میں نے آنکھیں کھولی ہی کیوں؟

بوسٹن کا ذکر آتا ہے تو وہاں کی ٹی پارٹی کی یاد ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ جب ہزاروں کالونسٹ نے برطانوی حکومت کی نا انصافی پر مبنی ٹیکس پالیسی کے خلاف احتجاجاً تین جہازوں پر لدے چائے کے بکسے، بوسٹن کی بندرگاہ پر اُلٹ دیے تھے۔ یہ واقعہ امریکا کی انقلابی لہر میں ایک ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوا۔اس تاریخی واقعے پر پُرجوش پوری روشنی ڈالتے ہوئے، بلکہ پانی پھیرتے ہوئے یہ کہتے ہیں''یوں بھی چائے کو گھوم پھر کر سمندر میں ہی جانا تھا۔''

ہمارے ہاں بہت سے انقلابات محض چائے کی وجہ سے نہ آسکے۔ جہاں ہر کام کو اپنے وقت پر نہ کرنے کے لیے یہ عذر پیش کیا جاتا ہو:

''ذرا چائے پی لی جائے ۔۔۔ پھر کچھ کام کیا جائے'' یا ''ذرا سا کام کیا جائے ...... پھر بہت ساری چائے پی جائے۔''

وہاں لوگوں کی ذاتی زندگیوں میں بھی انقلابات آتے آتے رہ جاتے ہیں۔

ٹیسٹ کرکٹ میں بھی چائے دوہرا کردار اَدا کرتی ہے۔اکثر ......ٹی بریک کے بعد کا سیشن بڑا غیر یقینی ہوتا ہے۔شام کو چائے کے بریک سے لوٹنے کے بعد فیلڈر چُست اور بلے باز سُست ہو جاتے ہیں۔وہ اگلے دن کے لیے وکٹ بچانے کی کوشش میں۔۔ کوئی کوشش کرتے نظر نہیں آتے۔ جب کہ فیلڈنگ سائڈ۔۔۔ اٹیکنگ (Attacking) اور ایگریسیو (Agressive) ہو جاتی ہے۔شاید انتظامیہ، فریقین کو دو مختلف اقسام کی چائے پلاتی ہے۔ فیلڈروں کو چائے ''برائے غضب'' اور بلے بازوں کو چائے 'برائے ادب'۔

سب سے بہترین چائے، سطحِ سمندر سے تین ہزار فٹ کی بلندی پر اُگتی ہے۔چائے کی کاشت کے لیے انتہائی سرد آب و ہوا کی ضرورت ہوتی۔کتنی عجیب بات ہے! برودت میں وجود پانے والی چیز ۔۔۔ وجود کو گرمانے کے کام آتی ہے۔ بھارت، چین اور سری لنکا کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ پوری دنیا کی چائے سے تواضع کرتے ہیں۔ بلکہ بعض مغربی ممالک کو اِتنا چُست رکھتے ہیں کہ وہ ہمہ وقت ''اُن کے'' افعال و اعمال پر کڑی نظر رکھ سکیں۔

ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی
صدر شعبہ اُردو (جامعہ اُردو)

پروفیسرِ بے وقت

وہ کل تشریف لائے ،محکمہ کی جانب سے ملا مراسلہ مجھے دکھایا ۔ میں نے اُنھیں سلام کرکے چائے پلوائی اور ساتھ ہی گھنٹی بجا کر کلرک کو بلایا اور سیکریٹری صاحب کو فون پر مطلع کردیا کہ صاحب اکنامکس کے لیکچرر صاحب آچکے ہیں، ان کی جوائننگ لے کر سیلری جاری کروا رہا ہوں۔ تدریسی اسٹاف پر نام لکھوالیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ کے جانے کے بعد کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔ وہ چلے گئے۔

چار دن بعد مجھے سیکریٹری تعلیم کی جانب سے کال موصول ہوئی۔

''سلام علیکم!''

''جی جناب؟'' میں نے پوچھا۔

''سر جی، آپ کے ڈپارٹمنٹ میں ایک نوجوان لیکچرر تشریف لائے ہیں، انھوں نے اپنی جوائننگ میں خود کو ''پروفیسر'' اور تجربہ' تیس سال' لکھا ہے؟ سر یہ پوسٹ تو 18 گریڈ کی ہے؟''

میں حقیقتاً پریشان ہوگیا۔

''موصوف کو بلائیے!'' پٹے دار سے کہا۔

وہ تشریف لائے ۔میں نے معاملہ اور اپنی مجبوری بتائی ۔ناراض ہوگئے ۔فرمایا: ''ڈاکٹر صاحب، پرائیویٹ کالجوں میں ہم نے دو سال اور ٹی وی پر ایک سال کام کیا ہے، یہ ہوگئے تیس سال۔''

''لیکن اللہ کے بندے، یہ تو تین سال ہوئے!''

وہ مسکرائے: ''ڈاکٹر صاحب، آپ ہماری عمر ۲۷ سال شامل کرنا بھول گئے شاید!''

ہم بھونچکا رہ گئے اور اُسی وقت سیکریٹری صاحب کو فون کیا:

''جی ڈاکٹر صاحب؟ فرمایئے!''

''سر، فرحان صاحب کی ذہنی عمر تیس سال ہی ہے، فُل پروفیسر ہیں۔''

وہ رو پیٹ کر خاموش ہو رہے ۔بعد میں افسروں نے بتایا کہ سر سیکریٹری صاحب گیارہ سال بعد آپ کے کس ''جوک'' پر ہنس رہے تھے؟ زاروقطار!

ہم خاموش رہے۔

موصوف سے ہماری دوستی نہ ہوسکی۔ عجیب پراسرار طبیعت کے مالک تھے۔ اسٹاف میں کُرسی بچھا کر، یعنی کرسی کی پشت دیوار سے ٹکا کر لیٹ جاتے۔ ہم جامعہ کے دورے پر نکلتے تو وہ ہمیشہ ہمیں ''لیٹنے اور بیٹھنے'' یعنی ''لیٹھنے'' والے انداز میں ملے۔

اُن کی بھی ہم سے دوستی نہ ہوسکی۔ وہ ''کشیفوں'' کے کاری گر

اور ہم ''لطیفوں'' کے پروردہ۔

ایک دن آفس میں دندناتے گھسے اور بولے: ''سر باہر کچھ ماہر آرٹسٹ آپ سے ملنا اور آپ کی فوٹو لینا چاہتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''سر وہ آپ کی تصویر دیکھ دیکھ کر شاید فرعون کی تصویر بنائیں گے۔''

''اچھا، بھیجئے!''

''جی شکریہ!''

اسی طرح ایک مرتبہ پروفیسر شاہد اقبال اور ڈاکٹر واجد دیوار کے سہارے کھڑے طبیعات کی تجربہ گاہ کی دیوار کے ساتھ لگے کھمبے کی اونچائی سے متعلق بحث کررہے تھے۔ موصوف قریب سے گزرے، کھڑے ہوکر اُن کی گفتگو سُنی، بولے: ''آپ حضرات فضول بحث کررہے ہیں، یہ جو اسی سائز کا دوسرا کھمبا زمین پر پڑا ہے، اس کی لمبائی ماپ لیں، آپ کو پتا چل جائے گا کہ کھمبا کتنا لمبا ہے۔'' موصوف تو یہ کہہ کر چلے گئے لیکن ڈاکٹر واجد الدین بولے: ''اس چریے کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ ہم کھمبے کی لمبائی نہیں، بلکہ اونچائی ماپنا چاہتے ہیں، اب اس کو بھی اسی ڈاکٹر نے بھرتی کیا ہے جامعہ میں!''

ایک دن موصوف نے اعلان کردیا کہ وہ لائبریری کو اپنے کندھے پر اٹھائیں گے۔ تمام لوگ جمع ہوگئے۔ موصوف رومال اپنے کاندھوں پر رکھ کر پروفیسر واجد سے بولے: ''یار پہلے لائبریری اٹھا کر میرے کندھوں پر تو رکھو۔''

کلاس میں پڑھانے کے دوران موصوف نے دیکھا کہ باہر آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بچوں سے پوچھا: ''ہاں میاں! بتاؤ بے موسم بارش کسے کہتے ہیں؟''

ایک بچہ بولا: ''سر میں بتادوں؟''

''جی کہیے!''

''سر وہ بارش جو ہمارے یونیورسٹی میں آنے کے بعد برستی ہے۔''

ایک روز موصوف کا کچی پہلی کا طالب علم بچہ ماں سے بحث کررہا تھا: ''امی میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔ اس پر سے ابھی ابھی ایک چھوٹا سا چوہا گزرا ہے۔'' ماں تنگ آکر موصوف کو بلا لائی۔

موصوف نے تین چار بار عینک صاف کرکے لونڈے کو دیکھا، وہ بضد تھا کہ روٹی پر سے چوہا گزرا ہے۔

فرمایا: ''ابے اُلّو کے پٹھے، کھالے روٹی، یہ اللہ کا رزق ہے، اچھا بتاؤ تو بھلا، چوہے نے جوتے تو نہیں پہنے ہوئے تھے، پھر روٹی گندی کیسے ہوگئی۔''

بچہ اُن ہی طرح ''ہوں'' کہہ کر رغبت کے ساتھ روٹی کھانے لگا۔

ایک روز موصوف اپنے گھر کے سامنے ایک غریب خوانچہ فروش کو ڈانٹ رہے تھے۔

پڑوسی ملک صاحب نے پوچھا: ''اجی پروفیسر صاحب، کیوں ڈانٹ رہے ہیں غریب کو؟''

فرمایا: ''یہ بدمعاش جانتا ہے کہ میرے سر پر ایک بھی بال نہیں، پھر بھی میری بیوی کو کنگھے بیچنے آیا ہے۔''

ایک روز چوکیدار ان کے کمرے میں روتا ہوا آیا کہ صاحب شام کے چوکیدار نے میری دیسی مرغی چُرا لی، اس سے پہلے کنگھا، پھر برش، پھر شیمپو اور آج مرغی چرائی ہے۔ اُسے بلایا۔ پوچھا۔ وہ بولا: ''ہاں صاحب، جتنا جتنا یہ چوکیدار سینئر ہورہا ہے، اور اس کی تنخواہ میں اضافہ ہورہا ہے، ویسا ہی میں چوری کے مال کا ریٹ ہائی کررہا ہوں۔''

شام کے چوکیدار کو ''مارکیٹنگ ایڈجسٹمنٹ'' کے اصولوں کے

شدید محبت

ایک جوان شاعر نے کسی خاتون کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ''مجازؔ صاحب، مجھے اُن سے شدید محبت ہوگئی ہے۔ اس محبت نے میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ خدا کی قسم جب تک اُس حسینہ کے متعلق چھ نظمیں نہیں کہہ لوں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا!''

مجازؔ نے جواب دیا ''لیکن چھ نظمیں سننے کے بعد اُس کی حالت محبت کرنے کے لائق بھی رہ جائے گی؟''

مطابق معاف کر دیا اور صبح کے چوکیدار کو نقصان کی رقم جیب سے ادا کر دی۔

بولے: ''اب تم جرمانے کے لئے خوش خط اُردو میں درخواست لکھو۔''

شام کے چوکیدار نے پوچھا: ''صاحب جی، جُرمانہ کتنا ہوگا؟''

فرمایا: ''سات روپے۔''

وہ موصوف کے ہاتھ پر دی گئی رقم میں سے دس کا نوٹ رکھ کر بولا: ''صاب، یہ لے لو اور معاملہ ختم کرو، آپ خوش خطی پر بھی جرمانہ لگا دوگے اور میری پکّی نوکری جائے گی۔''

''ہُوں'' کہہ کر خاموش ہو رہے۔

ڈاکٹر واجد بولا: ''ابے تجھے دس روپے کا تو فائدہ ہو گیا نا پروفیسر۔''

امتحانی کاپیاں جانچتے ہوئے حسن سے کہا: ''تمہارا مضمون بہت اچھا ہے، مگر لفظ بہ لفظ جمیل کے مضمون سے ملتا جُلتا ہے، اس سے میں کیا نتیجہ اخذ کروں؟''

حسن میاں بولے: ''سر یہی کہ جمیل کا مضمون بھی اچھا ہے!''

''ہُوں!!'' کہہ کر اتفاق فرمایا۔

ایک روز میرا دل گھبرایا۔ موصوف کُھل نہیں رہے تھے۔ بُلوا کر پوچھا: ''بھائی آپ پروفیسری کرتے کرتے کہیں چلے تو نہیں جائیں گے؟''

بولے: ''جی نہیں سر، اس سے پہلے بھی میں ایک جگہ دس سال رہا اور بالکل نہیں بھاگا۔''

میں خوش ہو گیا۔ ''ارے واہ، قابل پروفیسر کی یہی نشانی ہے، لیکن کہاں رہے آپ مسلسل دس سال؟''

فرمایا: ''سر، جیل میں اور کہاں!''

موصوف نے پروفیسر شاہد اقبال اور ڈاکٹر واجد سے ساز باز کر کے نئی نئی کرکٹ سیکھی اور تمام کی بیگمات کو دیکھنے بلایا۔ میچ شروع ہوا۔ ان کی نظر کمزور تھی۔ دورانِ کھیل عینک لگانا تضحیک گردانتے۔ بیٹنگ کی باری آئی تو واجد بہت دیر تک بالنگ کراتے رہے۔ واجد پوری رفتار سے آتا، گیند پھینکتا لیکن موصوف کسی ایک گیند کو بھی نہ کھیل پائے۔ نہ ہی انہوں نے کوشش کی۔ تھوڑی دیر یُوں ہی ہوتا رہا۔ آخر اُن کی بیگم جھنجھلا کر چیخیں: ''یہ کیا مذاق ہے بھئی، مجھے سالن بھی مکمل کرنا ہے، مغرب ہونے والی ہے، آپ کرکٹ کیوں نہیں کھیلتے؟ ڈاکٹر واجد آتے ہیں اور گیند پھینک کر چلے جاتے ہیں۔''

موصوف نے چشمہ جیب سے نکال کر لگایا اور بیگم ''پہچان'' کر بولے: ''حد کرتی ہو، مذاق میں کر رہا ہوں یا واجد؟ گھنٹہ بھر سے یہ آتا ہے اور بازو گھما کر چلا جاتا ہے، گیند پھینکے گا تو ہٹ لگاؤں گا، یہ گیند کیوں نہیں پھینکتا۔''

واجد تڑپ کر بولے: ''ابے اگر تجھے ڈاکٹر صاحب نے اپائنٹ نہ کیا ہوتا تو گیند کے بدلے کسی اور شے کو پھینکتا۔''

ایک روز مجھے شام کے چوکیدار اور سیکوریٹی اسٹاف نے آکر مشورہ دیا کہ سر آپ جامعہ کی مرکزی نمایاں دیوار پر جہاں سرکاری نوٹس وغیرہ چسپاں کیے جاتے ہیں، کچھ ایسا لکھوا دیں کہ یہ دیوار انتہائی تاریخی اور قدیم لگے۔ موصوف شام کی واک کر کے جامعہ کے احاطے میں واقع اپنے بنگلے میں جا رہے تھے۔ میں نے آواز دے کر بلایا: ''فرحان میاں، فرحان مٹھانی صاحب!!!''

''جی سر'' آکر پوچھا۔

میں نے معاملہ گوش گزار کیا۔ موصوف دس منٹ تک لان میں پڑی کرسی پر ''لیٹھے'' سوچتے رہے، اچانک اُٹھے، چوکیدار سے برش لیا اور دیوار پر لکھا: ''ہم قائدِ اعظم کو جامعہ کا دورہ کرنے پر خوش آمدید کہتے ہیں، سنگِ بنیاد: ۸/ ستمبر ۱۹۴۸ء۔''

(نوٹ: اس سے زیادہ بددل، بدنظر اور بدعقیدہ ہو کر میں نے اپنی پینتیس، چالیس سالہ ادبی زندگی میں اور کوئی تحریر نہیں لکھی، یہ بھی جناب نوید ظفر کیانی کی محبت اور اُن کے بارہا ذلیل و خوار کرنے پر جلدی جلدی بٹن چلا کر لکھ دی ہے، بخدا کوئی بھی موڈ نہیں تھا۔ ان دنوں ایک روحانی کتاب پر کام کر رہا ہوں۔ اف اللہ، ہم تو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔۔۔۔ مجیب ظفر انوار حمیدی)

کائنات بشیر، جرمنی

ہاہا۔۔۔ہی ہی۔۔۔ہو ہو

مرد لڑنے سے پہلے اور عورتیں بعد میں بحث کرتی ہیں۔
مگر کرتے ضرور ہیں۔۔۔۔۔ہاہاہا

وہ آئی، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔۔۔۔
وہ آیا، اس نے جھانکا اور جوتیاں کھا کر چلا گیا۔۔۔۔ہی ہی ہی

لوگ شادی اسلیے کروانا پسند کرتے ہیں کہ پھر محلے والے ان پر شک نہیں کرتے۔
نہیں پھر محلے والے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں۔۔ہوہوہو

دو عورتوں کے مقابلے میں ایک مرد کو اس لیے فوقیت دی جاتی ہے کہ چالاکی اور عیاری میں مرد عورتوں پر بھاری ہے۔
اور عورتیں وزن میں۔۔۔۔ہاہاہا

ہمارے نوے فیصد مرد گاؤں میں حاکم اور شہر میں محکوم ہیں۔
بدلی۔۔۔ہوا پانی۔۔۔۔ہی ہی ہی

پوپ موسیقی کو سن کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے موسیقی سے انتقام لیا جا رہا ہے۔
انتقام بھی ایسا جو سر چڑھ کر بولے۔۔۔۔ہوہوہو

جب کسی حسینہ کو دیکھتا ہوں تو آنکھ پھڑکتی ہے اور دل تیز تیز دھڑکنے لگتا ہے۔۔۔ایک مریض کا ڈاکٹر سے کہنا،،
اور اعتراف جرم بھی۔۔۔ہاہاہا

اگر لڑکے کے بال سفید ہو جائیں تو بیماری اور لڑکی کے ہوں تو چاندی کے تار۔
فرق صاف ظاہر ہے عاشق اور محبوبہ کے بالوں میں۔۔۔۔ ہی ہی ہی

ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بیٹا سردار بنے لیکن جب بیوی آتی ہے تو اسے غلام بنا لیتی ہے۔
کیا کہنے مٹی کے مادھو۔۔۔۔۔ہوہوہو

پہلے ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑتے تھے اور اب ایک سچ چھپانے کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑتے ہیں۔
وقت وقت کی بات ہے بھیا۔۔۔۔ہاہاہا

آج اگر دو بچے ہوں تو مرد کو بیوی پر حاوی اور اگر نو بچے ہوں تو بیوی کو مرد پر حاوی سمجھا جاتا ہے۔
ترازو کے پلڑے تو اوپر نیچے ہوتے ہی ہیں۔۔۔ہی ہی ہی

گم شدہ بالی کو کیا تلاش کرنا بیچارے کسی لڑکے کے کام آ جائے گی۔ایک لڑکی کا اپنی سہیلی کو مشورہ
ایک پنتھ دو کاج۔۔۔۔ہو ہو ہو

فیشن اور اونٹ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ دونوں کی کوئی کل سیدھی نہیں۔
کل تو زمانے کی بھی سیدھی نہیں۔۔۔۔ہا ہا ہا

ایک کنوارہ سب کچھ جانتا ہے۔جبکہ شادی شدہ اپنی بیوی تک کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔
سمجھنے کی ضرورت بھی کیا ہے بھیا۔۔۔۔۔۔ہی ہی ہی

میں عوام کو دھوکا دیتا ہوں، میری بیوی مجھے دھوکا دیتی ہے۔
ایک سیاستدان
نہلے پہ دہلا۔۔۔۔۔ہو ہو ہو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

کون کہتا ہے کہ اُس کا حوصلہ کم پڑ گیا
عاشقِ صادق کو سینڈل کا تلا کم پڑ گیا
دس پراٹھے بیس انڈے اور دو حلوے کے تھال
مولوی صاحب کو پھر بھی ناشتہ کم پڑ گیا
جب نہائے ختم پانی ٹینکر کا کر دیا
پونچھنے بیٹھے تو اُن کو تولیہ کم پڑ گیا
ہم نے عرضی دی پر ہم کو باس نے چھٹی نہ دی
لمبی رخصت کے لئے اِک عارضہ کم پڑ گیا
کوئی سنتا ہی نہ تھا حرص و ہوس کے شور میں
ہم بہت چیخے مگر اِک نرخرہ کم پڑ گیا
پھر وہی دورِ طرب ہے پھر وہی عیش و نشاط
ہم کو عبرت کے لئے اِک زلزلہ کم پڑ گیا
''درسِ ویلنٹائینی'' سے مانگ اُس کی بڑھ گئی
عاشقوں کے واسطے کچا گھڑا کم پڑ گیا
بغضِ افرنگی اِدھر اور جاہلیت اُس طرف
آ گئی ''داعش'' کہ جب ''القاعدہ'' کم پڑ گیا
طنز کی چٹنی بنا ہوتے نہ مظہر شعر ہضم
ہاں ظرافت کی کمی سے ذائقہ کم پڑ گیا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آتا نظر ہے یارِ طرح دار خواب میں
بے خوف اُس کا کرتے ہیں دیدار خواب میں
اقرار خواب میں کبھی انکار خواب میں
محبوب ہم کو کرتا ہے اب خوار خواب میں
ابا کا اس کے خوف نہ اماں کا ڈر ہمیں
آتے ہیں ہم پھلانگ کے دیوار خواب میں
آ کر چلا نہ جائے کہیں یارِ دلربا
رہتا تمام شب ہوں میں بیدار خواب میں
ہائے ستم ظریفی کہ پھر آنکھ کھل گئی
اور رہ گیا ادھورا مرا پیار خواب میں
کہتا تھا ڈاکٹر نہ اٹھاؤ ابھی ہمیں
دو سو کھڑے مطب میں ہیں بیمار خواب میں
چالان کوئی کر نہیں سکتا ہمارا اب
پولیس کیسے ناپے گی رفتار خواب میں
شاپنگ سے اور عیدی سے چھٹ جائے گی یہ جان
خواہش ہے آئے عید کا تہوار خواب میں
پابندِ شرع اب بھی ہیں کرکے کئی نکاح
ہیں چار جاگتے ہوئے اور چار خواب میں
ماری ہے لات ہم نے بھی حاتم کی قبر پر
بانٹے ہیں ہم نے درہم و دینار خواب میں
جھگڑا بھی خوب ہوگیا عزت بھی رہ گئی
ہم نے اٹھائی لذتِ تکرار خواب میں
پیتے رہے مزے سے مئے ناب صبح تک
پکڑا نہ جا سکا کوئی میخوار خواب میں
دادِ سخن سمیٹ رہا تھا کہ جاگ اٹھا
مظہر نہ سارے پڑھ سکا اشعار خواب میں

ڈاکٹر عزیز فیصل

وہ پھرتا ہے کیوں مارا مارا زمیں پر
بنا کر بجن گیارہ بارہ زمیں پر
بقول میاں، وہ زن ِ آنجہانی
کہیں آ نہ جائے دوبارہ زمیں پر
فقط اے بشیراں تمہارے علاوہ
نہیں کوئی اپنا ہمارا زمیں پر
وہ عاشق کہ جس کا تخلص فلک تھا
پٹخ کر اسے کس نے مارا زمیں پر؟
لپک کر اٹھایا تھا قاضی نے اس کو
اچانک گرا جب چھوہارا زمیں پر
پلاٹ اس سے مانگیں کوئی کارنر کا
بشیراں کا ہے جب اجارا زمیں پر
فلک پر تو جوڑا تھا چھیمو سیاس کا
مگر اس نے ڈھونڈی تھی "زارا" زمیں پر
اسے چاند والی وہ بڑھیا کہے گی
چلے جاو واپس خدارا زمیں پر
وہ میلے قدم اس سے مَس کر گئی ہے
سو واجب ہوا ہے پچارا زمیں پر

ڈاکٹر عزیز فیصل

یاد ہم کر کے جن کو روتے ہیں
وہ تو پطرس کو پڑھ کے سوتے ہیں

شعبہ عشق کے بنے ہیں امین
قیس و لیلی کے جتنے پوتے ہیں

جن کے جبڑوں میں ایک دانت نہیں
ان کے گھر میں کئی سروتے ہیں

دل کے ننھے فلیٹ میں عشاق
مہ جبینیں کئی سموتے ہیں

گیدڑوں میں یہ چھڑ گئی ہے بحث
شوہروں میں بھی شیر ہوتے ہیں؟؟

چائے میں بسکٹوں کی طرح عزیز
کب پکوڑوں کو بھی ڈبوتے ہیں

سید فہیم الدین

پہلے ہوئی جدائی اکیسویں صدی میں
میکے سے لوٹ آئی اکیسویں صدی میں

اُن کی ہے بے وفائی اکیسویں صدی میں
اپنی وہی ڈھٹائی اکیسویں صدی میں

مردوں کے کام سارے کرنے لگی ہے نازک
ہم کیا کریں گے بھائی اکیسویں صدی میں

شادی سے پہلے ہم بھی بس ایک تھے اکیلے
اب ہو گئے ہیں ڈھائی اکیسویں صدی میں

مہنگائی ہے الگ سے اور ٹیکس لینے والے
سب ہو گئے قصائی اکیسویں صدی میں

سید فہیم الدین

محفل میں وہ حسین ہے اب اوٹ کے بغیر
ہم بھی نکال لائے ہیں دل کھوٹ کے بغیر

شاعر ہوں پلے شعر و سخن کے سوا ہے کیا
ہے جیب دل ک پاس مگر نوٹ کے بغیر

اِک دور وہ کہ جب کوئی دھوتی نہ پاس تھی
آتے نہیں ہیں اب وہ مگر کوٹ کے بغیر

بازی جو چل پڑی ہے بساطِ حیات پر
شطرنج کھیلئے گا مگر گوٹ کے بغیر

اُس انجمن میں سب ہی گئے ہیں مگر فہیم
تشریف کوئی لایا نہیں چوٹ کے بغیر

محمد عاطف مرزا

اب عطا ہوتی ہے نعمت جوتیوں کے ہار کی
کر رہے ہیں اِس طرح سیوا وہ اپنے یار کی

ایک سُوٹے کی بدولت مست بیٹھے ہیں وہ آج
بات کر بیٹھے تھے ہم کل مستی کردار کی

سارے شاعر گردشِ دوراں کے چکّر میں پھنسے
کوئی بھی کرتا نہیں ہے بات سندر نار کی

چُست پاجامے کے مانند اِس کی حالت ہو گئی
کیا عجب صورت بنی ہے آج یہ شلوار کی

ہر ورق پر خوبصورت مورتیں ہیں جا بجا
بڑھ رہی ہے سرکولیشن اِس لیے اخبار کی

گاؤں سے کچھ دُور جانا تھا نہ جن کے بس میں کل
لے کے آتے ہیں وہ گوری اب سمندر پار کی

ہم دھڑا دھڑ کر رہے ہیں آج کل پیروڈیاں
خیر مانگو تم بھی اب تو شاعرو ! اشعار کی

ریفریجریٹر نے عاطف کام آساں کر دیے
آج بدھ ہے ، کھا رہے ہیں دال ہم اتوار کی

محمد عاطف مرزا

اکیلی وہ نہیں آئی ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
ہیں اُس کے سنگ دس بھائی ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
"وزن" اُس کا زیادہ ہے ، پھٹی آواز سے اُس کی
غزل اُس نے اگر گائی ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
مجھے بیگم نے جب دیکھا تو نظریں تھیں مری اوپر
کھڑی تھی چھت پہ ہمسائی ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
مرے پیچھے پڑی ہے آج کل یوں ہاتھ منہ دھو کر
مرے بھائی کی بھرجائی ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
پلی ہے وہ تو شہروں میں بڑے ہی ناز ، نخرے سے
مگر بندہ ہے صحرائی ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
سبھی کی آرزو ہے یہ کہ اُس سے گفتگو کرتے
مگر تھوڑی ہے وہ شائی * ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
بڑے تایا کھڑے تھے گرلز کالج کے مقابل کل
بتاؤں اور کیا تائی ! کوئی پھڈا نہ ہو جائے
معیشت پر ہماری اِس طرح سے ہو گئے قابض
یہودی اور عیسائی ، کوئی پھڈا نہ ہو جائے
میں اپنے باس کی بیٹی سے عاطف دوستی کر لوں
مگر یہ نوکری بھائی ! کوئی پھڈا نہ ہو جائے

عرفان قادر

جس گلی سے گزر گیا ہوں میں
پان سے پینٹ کر گیا ہوں میں

جیب کترے کو یہ بتا دیجے
جیب اُس کی کتر گیا ہوں میں

کس قدر خوش نما ہے لان اُس کا
اس لیے گھاس چر گیا ہوں میں

کس میں ہمت ہے مجھ سے واپس لے؟
لے کے قرضہ مکر گیا ہوں میں

پسلیں تک نہ چھوڑیں دفتر میں
لے کے فائل گزر گیا ہوں میں

آو مل جل کے ڈھونڈتے ہیں سبھی
کون جانے کدھر گیا ہوں میں؟

باس پہلے تھا "تر بتر" بیٹھا
جب لگانے "بٹر" گیا ہوں میں

آنے والی حکومتیں روئیں
ایسے کرتوت کر گیا ہوں میں

لب نہیں کھلتے درد کے مارے
وہ سمجھتی ہے ڈر گیا ہوں میں

عرفان قادر

تین برسوں میں "وَلَد" پانچ کی تعداد میں ہے
ایسا ممکن کبھی اِس تھوڑی سی میعاد میں ہے؟

عشق کے پودے کو پروان چڑھانے کے لئے
ایک ناکام سا عاشق طلبِ کھاد میں ہے

ان کو اُلٹا کرو، پھر بھی ہیں یہ دونوں سیدھے
اتفاق ایسا ہر اک ساس میں داماد میں ہے

جیسے حالات ہوں، خوش رہتے ہیں "جورو کے غلام"
ایسا جذبہ کبھی دیکھا کسی آزاد میں ہے؟

آؤ این جی او بناتے ہیں چلو ہم بھی کوئی
خود کمانے میں کہاں لطف جو امداد میں ہے

شعر کہتے ہوئے ہر بار اُچھلتا کیوں ہے
ٹارزن نام کا کوئی ترے اجداد میں ہے

عقدِ ثانی کا ہو، اے کاش! مُیسر موقع
ایک معصوم سی خواہش دلِ نا شاد میں ہے

دس کلو مرغِ مُسلّم تو وہ کھا بیٹھا ہے
دیگ حلوے کی منگائی ہوئی پھر بعد میں ہے

خالدؔ محمود

مرغانِ مرغن ہوں کہ بکرانِ گرامی
ہر ڈش پہ نظر رکھتا ہے مہمانِ گرامی

نسخہ کوئی ایجاد بھی کر لیں تو لحد میں
لے جاتے ہیں ساتھ اپنے طبیبانِ گرامی

اب ڈیٹ بھی ماریں تو لگا رہتا ہے دھڑکا
بروقت پکڑ لیتے ہیں بچگانِ گرامی

اب فیس کے بارے میں بتائیگا مسیحا
دم سادھ کے بیٹھے ہیں مریضانِ گرامی

کر دیتے ہیں دامادِ مؤدب کا کباڑہ
ویک اینڈ پہ جب آجاتے ہیں سسرانِ گرامی

پاؤں کی طرح ہاتھ بھی میڈم کا تھا بھاری
چنتا ہی رہا اپنے میں دندانِ گرامی

درکار ہے ایندھن کے لئے ایک ہی پُڑیا
پر تول کے بیٹھے ہیں جہازانِ گرامی

افلاس و فروغت کا نتیجہ ہے یہ خالدؔ
ہر سال ہوئے جاتے ہیں طفلانِ گرامی

خالدؔ محمود

کھا لی ہے جو بھولے سے دوا اور طرح کی
ہے پیٹ میں گُڑگُڑ کی صدا اور طرح کی

دھڑکا ہے جو دل اب کے ذرا اور طرح سے
ڈالی ہے نظر اُس نے ذرا اور طرح کی

محبوبہ کو منکوحہ بنا بیٹھے تو جانا
جرم اور طرح کا ہے سزا اور طرح کی

تھی جس پہ نظر میری، اُڑا لے گیا ہم زلف
آئی میرے حصے میں بلا اور طرح کی

اِک اور بھی مانگوں گا ترے جیسی خدا سے
میں تجھ سے نبھاؤں گا وفا اور طرح کی

یہ دال تو گلتی نظر آتی نہیں خالدؔ
ہنڈیا کوئی چولہے پہ چڑھا اور طرح کی

روبینہ شاہین بیناؔ

لیڈر تو یونہی قوم کی خدمت نہیں کرتا
کرتا ہے سیاست وہ عبادت نہیں کرتا

ہر بار میرے دل نے اسے ووٹ دیا ہے
یونہی تو کوئی مجھ پہ حکومت نہیں کرتا

سکھ چین کے بدلے میں میرا درد لیا ہے
وہ پیار تو کرتا ہے تجارت نہیں کرتا

رکھتا تو ہے کچھ وہ بھی محبت کا سلیقہ
ہاں ! پیار کے اظہار کی جرأت نہیں کرتا

نا اہل ہے جاہل ہے وہ دنیا کی نظر میں
عالم کہ جو بے وجہ بات پہ حجت نہیں کرتا

مت اس پہ وفاداری کا الزام لگاؤ
بیوی سے جو ڈرتا ہے بغاوت نہیں کرتا

لوشن وہ لگا رکھا ہے رخسار پہ بیناؔ
مچھر مجھے چھونے کی جسارت نہیں کرتا

روبینہ شاہین بیناؔ

گھر ہی اب چھوڑ گئے پیسے ادھارے لے کر
اب وہ ملتے ہی نہیں نوٹ کرارے لے کر

اس نے منگنی پہ کھلائی تھی مٹھائی لیکن
بعد شادی کے وہ ملتا ہے چھوارے لے کر

لوٹ لیتا ہے فقیروں کی کمائی دن کی
وہ تو کرتا ہے گزارا بھی گزارے لے کر

ہم نے کشکول بھی توڑا ہے بدلنے کے لئے
ہم نے تو ملک چلانا ہے سہارے لے کر

مجھ کو بجلی نے کیا تنگ تو میں سوئی نہیں
رات روشن تھی مری خواب ستارے لے کر

خودکشی کے لئے تھا اس نے دھماکہ کرنا
میری شادی پہ وہ آیا تھا غبارے لے کر

اچھے لگتے ہیں جوانی کے زمانے اس کو
بیٹھ جاتا ہے کہیں چند کنوارے لے کر

مار ڈالے گی اسے رات کی محفل بیناؔ
اس کی بیوی ہے کھڑی ہاتھ میں آرے لے کر

نوید ظفر کیانی

جو ہر برس نیا ماڈل یہاں بناتے ہیں
وہ خاندان نہیں کارواں بناتے ہیں

نری خبر کو خبر جانتے نہیں چینل
لگا کے تڑکے بہت سُرخیاں بناتے ہیں

نقیبِ امن و اماں بھی ہیں اور شکاری بھی
یہی سپر یہی تیر و کماں بناتے ہیں

یوں استطاعتِ مرلہ بھی وہ نہیں رکھتے
بنانے والے مگر کوٹھیاں بناتے ہیں

سدھارتی ہے کسی دوسرے پیا کے گھر
جسے بھی خواب میں منے کی ماں بناتے ہیں

نوشتہ رکھتے ہیں تردید بھی وہ پہلے سے
جو لیڈرانِ غبی کے بیاں بناتے ہیں

ستم کہ پہیئے بنانے تھے حکمرانوں نے
وہ جس مواد سے بیساکھیاں بناتے ہیں

یہی ہے کام اگر اس کو کام کہتے ہیں
وہ فیس بک پہ فقط سیلفیاں بناتے ہیں

بہت سے ایسے بھی ہیں مینے جو دنیا میں
محبتوں کو بھی کارِ زیاں بناتے ہیں

نوید ظفر کیانی

لگتی ہے مجھے صاحبِ مغرور کی گردن
بجو کے بدن پر کسی لنگور کی گردن
حاضر ہے ہمہ وقت ترے ناز کی خاطر
ہر بوجھ اُٹھائے ترے مزدور کی گردن
چوروں کے ہیں ساتھی یہ گرہ کٹ (یہ مچھندر)
اب کون دبوچے کسی مفرور کی گردن
دیکھی تو ہوا شوقِ گلوبند مجھے بھی
کمخواب میں مستور کسی حور کی گردن
جب حُسن کے ہتھیار سے میں قتل ہوا ہوں
پکڑی نہ گئی کیوں بُتِ مغرور کی گردن
پھندہ کسی گردن میں اگر فِٹ نہیں ہوتا
دیتی ہے ہمیشہ ترے مقہور کی گردن
پھنیے کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے
ہر کوئی دباتا ہے سقنقور کی گردن
پھولی رہیں لیڈر کے مفادات کی توندیں
کٹتی ہے تو کٹتی رہے دستور کی گردن
لکھیں گے غزلیات چرائے ہوئے فن سے
ناپیں گے کسی شاعرِ مشہور کی گردن

خالدؔ عرفان

اُس شوخ کی مشکل کو سنبھالے کے لئے ہم
شادی کو کوئی اور حلالے کے لئے ہم

چھپتی ہے رسالے میں غزل اور کسی کی
مر جائے ایڈیٹر تو مقالے کے لئے ہم

''سب وے'' میں ہمیں سب کے اندھیرے میں نہ بھیجو
اس شہر میں آئے نہیں کالے کے لئے ہم

سنتے ہیں اندھیرے میں وہ ہم سے کئی غزلیں
بجلی چلی جائے تو اُجالے کے لئے ہم

پھینکا جو کٹورا وہ نہاری سے بھرا تھا
لینا ہو نشانہ تو پیالے کے لئے ہم

ادرک کے نہیں ہیں یہ ہیں ادراک کے مصرعے
اور لوگ سمجھتے ہیں مسالے کے لئے ہم

یہ ندرتِ اظہارِ سخن ہائے ظرافت
کام آئیں گے اِک روز حوالے کے لئے ہم

خالدؔ عرفان

عدالت کی ہر اک تعزیر سے تنگ آ گئے ہیں
نئی تاریخ کی تاخیر سیت تنگ آ گئے ہیں

بنایا دوست جب سے فیس بک پہ تجھ کو ہم نے
تری اٹھارہویں تصویر سے تنگ آ گئے ہیں

کبھی مرغے کی فرمائش کبھی بکرے کی چاہت
عقیدت مند جعلی پیر سے تنگ آ گئے ہیں

بہت سے کیمرے بھی منہ بنانے لگ گئے ہیں
کئی انساں بھی حامد میر سے تنگ آ گئے ہیں

بہت ہی خوبصورت اسلحہ خانہ ہے تیرا
ہم اس کے مقصدِ تعمیر سے تنگ آ گئے ہیں

تری بھیجی ہوئی معجن ہم نے چاٹ تو لی
پر اس کی آہنی تاثیر سے تنگ آ گئے ہیں

مزارع کی طرح داماد کو رکھتا ہے گھر میں
تمہارے باپ کی جاگیر سے تنگ آ گئے ہیں

سنا ہے چائنہ کی مرغیاں خوش ذائقہ ہیں
جنابِ شیخ دیسی کھیر سے تنگ آ گئے ہیں

تمہاری عمر تو سولہ پہ آ کر رُک گئی ہے
تمہارے حُسن کی تاخیر سے تنگ آ گئے ہیں

کئی اُستاد بڑھتے ہیں نہیں چرکن سے آگے
کئی تک بند ''ذوق و میر'' سے تنگ آ گئے ہیں

دیارِ غیر میں خوش رنگ اسیروں کی طرح ہیں
ہم اپنے پاؤں کی زنجیر سے تنگ آ گئے ہیں

شوکتؔ جمال

اُس نے جب ہم سے کہا اھلاً و سہلاً مرحبا
ذرہ ذرہ گا اٹھا اھلاً و سہلاً مرحبا

بے ادب کچھ لوگ بھی بزمِ ادب میں آ گئے
اور یہی کہنا پڑا اھلاً و سہلاً مرحبا

مانگ کر قرضہ مجھے نادم نہ کرنا تم مگر
جان و دل تم پر فدا اھلاً و سہلاً مرحبا

میرے گھر آتے ہی بچوں نے سُنائی یہ خبر
کچھ نہیں گھر میں پکا اھلاً و سہلاً مرحبا

دیکھ کر صدقے کا اک بکرا ہمارے ہاتھ میں
پیر و مرشد نے کہا اھلاً و سہلاً مرحبا

در پہ لیلیٰ کے میاں مجنوں کے استقبال کو
تھا سگِ لیلیٰ کھڑا اھلاً و سہلاً مرحبا

دشمنوں نے کس طرح شوکتؔ کو گھیرا دیکھئے
بابِ مقتل پر لکھا اھلاً و سہلاً مرحبا

شوکتؔ جمال

اُن سے جب تنہائی میں میری ملاقاتیں ہوئیں
بجلی و پانی پہ یا مہنگائی پہ باتیں ہوئیں

شیخ جی کے گھر میں جب سے دو مسماتیں ہوئیں
آئے دن جھگڑے ہوئے، ننٹے ہوئے، گھاتیں ہوئیں

اُن کے کوچے میں ملا جب سے کرائیہ پر مکاں
دن ہوئے ہیں عید گویا راتیں شبراتیں ہوئیں

پارٹیشن جب ہوا تو آپ ''سید'' ہو گئے
مختلف تب سے ہماری آپ کی ذاتیں ہوئیں

کچھ دنوں کے واسطے میکے میں تھا اُن کا قیام
چین سے وہ دن مرے گزرے، بسر راتیں ہوئیں

کل کچن میں آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر
یوں لگا صحرا میں بھی اِس بار برساتیں ہوئیں

دن تو ہیں سب ایک سے، لیکن گداگر کے لئے
سب سے افضل اور با برکت جمعراتیں ہوئیں

خود تو شوکتؔ انقلابی نظم پڑھ کر چل دیا
دے رہے تھے داد جو اُن کو حوالاتیں ہوئیں

تنویرالدین احمد پھولؔ

دیکھ کر دل میں لڈو لگے پھوٹنے جب وہ آئے تو پوری غزل ہو گئی
ہم کو دیکھا رقیبانِ محفل نے بھی سٹپٹائے تو پوری غزل ہو گئی

اپنی مونچھوں پہ وہ تاؤ دینے لگے ہم بھی قینچی لئے اُن کی جانب چلے
نصف مونچھیں کٹیں ایک ہی وار میں بڑبڑائے تو پوری غزل ہو گئی

اُن کی باتوں کا انداز کیا تھا عجب منہ سے اُن کے نکلنے لگیں سیٹیاں
ساتھ اُن کا نہیں دے رہی تھی زباں منمنائے تو پوری غزل ہو گئی

اسپ شیرازی ہیں شاعرِ بے بدل ہر گھڑی آپ کرتے ہیں فکرِ سخن
گھاس کھاتے رہے دُم ہلاتے رہے ہنہنائے تو پوری غزل ہو گئی

اپنے ہونٹوں کو وہ سرخ کرنے لگے پان منہ میں دبائے ہوئے آگئے
آنکھ چمکا کے کہنے لگے جانے کیا مسکرائے تو پوری غزل ہو گئی

دل کے گوشے میں ہے یاد اُن کی بسی کتنی اچھی تھی وہ رات برسات کی
آ رہے تھے ہمیں مارنے کے لئے لڑکھڑائے تو پوری غزل ہو گئی

کیسا پُر لطف منظر تھا وہ دوستو! سُن رہے تھے سبھی طائرانِ چمن
پھولؔ صاحب تھے ڈالی پہ رطب اللساں گُل کھلائے تو پوری غزل ہو گئی

تنویرالدین احمد پھولؔ

میم بیوی اور ہے خاوند جاٹ
مل گئے ہیں ساتھ مخمل اور ٹاٹ

اے پڑوسی! راز یہ بتلا ذرا
رات بھر کیوں بولتی ہے تیری کھاٹ

عیش رمضانی کرے رمضان میں
کھا رہا ہے روز چھولے اور چاٹ

کھول لی اُس نے کباڑی کی دکاں
مل گیا اُس کو جو اک سستا پلاٹ

گھاگ ہے لیڈر، بڑا مکار ہے
پانی وہ پیتا رہا ہے گھاٹ گھاٹ

تول پورا ہے بظاہر دیکھ لو
کھوکھلے اندر سے ہیں پتھر کے باٹ

کہہ دیا ٹیچر نے مانیٹر سے یہ
ناک گر کٹتی نہیں تو کان کاٹ

آئی دسترخوان پر سبزی و دال
ہو گیا مہمان کا چہرہ سپاٹ

یار میرے بن گیا ہے تو وزیر
جھونپڑا ہی کم سے کم کر دے الاٹ

اِس محلے سے گئی وہ نازنیں
ہو گیا ہے اب دلِ عاشق اُچاٹ

شیخ جی کا چہرہ یوں لگتا ہے پھولؔ
جیسے ہو تیزاب کی بوتل پہ ڈاٹ

عبدالحکیم ناصفؔ

بہت سے کارِ نمایاں جو کر کے دیکھتے ہیں
خیال آتا ہے اَب گھاس چر کے دیکھتے ہیں

یہ ہم جو رستے گلی شہر بھر کے دیکھتے ہیں
اُٹھائی گیر ہیں ڈھکّن گٹر کے دیکھتے ہیں

جبیں پہ اُن کے جو بَل ہیں ، ہُوا کریں بھائی!
جبیں کے بَل نہیں ، بَل ہم کمر کے دیکھتے ہیں

کچھ ایسا کام کریں خود بھی خوش ، خدا بھی خوش
جوان بیوہ کی اِمداد کر کے دیکھتے ہیں

جب اُس کے جسم پہ ہوتے ہیں مختصر کپڑے
تو آنکھ والے اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

ہے ایک ''روزنِ دیوار'' باتھ رُوم میں خوب!
''مکیں اِدھر کے بھی جلوے اُدھر کے دیکھتے ہیں''

اَنا کے خول کے باہر تو کچھ نہیں ناصفؔ
اَنا کے خول کے اندر اُتر کے دیکھتے ہیں

عبدالحکیم ناصفؔ

''تم نہ مانو مگر حقیقت ہے''
عشق اَنسان کی بُری لت ہے
ایک تُو ہی نہیں ہے گھر بھر میں
تیری امّاں بھی خوب صورت ہے
ایک رنڈوے نے آہ بھر کے کہا
مملکت دِل کی بے حکومت ہے
جب سے پالیٹشن ہُوا ہُوں میں
ڈاکوؤں تک پہ میری دہشت ہے
جام ہی جام جلوے ہی جلوے
صرف اِجلاس کی ضرورت ہے
اُن کا اندازِ گفت و گو توبہ
پان کھانے کی اُن کو عادت ہے
''واٹس اَپ'' پر مری ہے کل شادی
''فیس بُک'' پر تمھاری دعوت ہے
ٹل گئی ناف تو بٹھاؤں میں؟
گدگدانے کی کچھ اِجازت ہے!؟
کھا رہی ہے بٹر ، بریڈ ، پنیر
کتنی اعلیٰ تری علالت ہے
کس طرح گھر کرے گی تُو سیدھا
نو مہینے سے اُلٹی حالت ہے
سویمنگ پُول پر کبھی دیکھو
''زندگی کتنی خوبصورت ہے''
فائدہ فیملی پلاننگ کا!
ڈِش ہے ، ٹی وی ہے ، اور فرصت ہے
مُلک اور دِل کے تخت پر ناصفؔ
آج کل حکمران عورت ہے

عبدالحکیم ناصفؔ

ہماری جو مغرب زدہ کچھ خواتین ہیں
مزاجاً کسی کے مجازی خدا تین ہیں
دُعا کر رہے تھے مُصلّے پہ رو رو کے شیخ
اُدھورا مُسلماں ہوں کہ اہلیہ تین ہیں
یہ گنّے کا شربت ، یہ گنڈا ، یہ گنڈیریاں
ہمارے لیے پیلیے کی دوا تین ہیں
وٹامن کی گولی وہ کھانے لگی بے حیا
کسی سے سُنا ہے کہ اِس میں حیا تین ہیں
یہ چوتھی جو شادی رچائی ہے ہم نے ابھی
ہے چوتھی تو مسرور لیکن خفا تین ہیں
ہمارے تو چہرے پہ بارہ بجے ہیں ابھی
تمھاری گھڑی میں بجے کیوں سوا تین ہیں
وہ برہم ہُوئی دیکھ کر اِس غزل کی ردیف
وہ غرّائی میرے علاوہ یہ کیا تین ہیں
ہے اِس گھر کے لوگوں میں برداشت بالکل صفر
وہ ہیں تین افراد بیت الخلا تین ہیں
وہ جانِ وفا ، با وفا اور وفا کیش ہے
وہ دُبلی بدن ہے پر اُس میں وفا تین ہیں
میں سردی میں ہوں عصمہ، عظمیٰ، سمیرا کے ساتھ
کروں کیا رزائی ہے سِنگل رضا تین ہیں
سُنے کوسنے ، تالیاں ، نغمے شوہر غریب
ارے بیگمو! تم میں خواجہ سرا تین ہیں
جو امّاں نے دیکھیں ترے واسطے لڑکیاں
میاں ناصفؔ اُن میں سے شادی شُدہ تین ہیں

عبدالحکیم ناصفؔ

آنکھ دھونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی
دیکھو! رونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

خواب میں قابلِ سنسر ہی چلیں گی فِلمیں
تُم کو سونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

سازشیں کرتے رہو تم ، مگر ایوانوں میں
کانٹے بونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

شیخ جی! جو تمھیں کرنا ہے سرِ عام کرو
کسی کونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

دِل تو ہے دِل مری تنخواہ بھی لے لو لیکن
اِن کو کھونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

جانتا ہوں ترے نخرے تو بہت ہیں پھر بھی
مجھ کو ڈھونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

ہو گئی ہے مری شادی مگر اے لختِ جگر!
تجھ کو ہونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

آپ لے جائیں بڑے شوق سے لُٹیا میری
ہاں! ڈبونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

"پارلیمنٹ" کا "لوٹا" ہے یہ نلکا تو نہیں
چڈّی دھونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

بس اداؤں سے گرفتار کریں ناصفؔ کو
جادو ، ٹونے کی اِجازت نہیں دی جائے گی

منزّہ سید

فوج بچوں کی ہدف پر تیر ہے
عشق کی تکمیل کی تصویر ہے

لائے وہ کاندھے پہ آٹا لاد کر
میرے آگے دیگچی کفگیر ہے

میں بھی ڈھائی من کی دھوبن ہو گئی
اُن کے بالوں کی بھی اب آخیر ہے

پیٹ میں اُٹھتے ہیں میرے بھی مروڑ
اُن کے معدے میں بھی اب تبخیر ہے

عاشقی میں ہم نے دیکھے خواب جو
جان لیوا اُن کی یہ تعبیر ہے

عشق کے موذی مرض میں بس میاں
نسخۂ شادی بہت اکسیر ہے

منزّہ سید

گر ہمیں فرصت ہو تو کاموں میں گڑنا چاہیے
فیس بک سے بور ہو کر گھر میں لڑنا چاہیے
امتحاں میں فیل ہو کر اپنے ابا جی کے ساتھ
اپنی کوتاہی چھپانے کو اکڑنا چاہیے
بیٹیوں کے گھر میں بھی اپنی حکومت کے لئے
کچھ بہانہ کر کے سمدھن سے جھگڑنا چاہیے
لاکھ کوشش سے جو بن پائے نہ رائی کا پہاڑ
چغلیوں کی سِل پہ باتوں کو رگڑنا چاہیے
انکساری سے چھڑا لیں جان تگڑا دیکھ کر
ہاں مگر کمزور بندے پر بگڑنا چاہیے
رازداں کہہ کر جو ظالم سب سے کہہ دے راز کو
ایسے ظالم کو تو دوزخ میں ہی سڑنا چاہیے
دوسروں کی تھی لڑائی پڑ گئی میرے گلے
راہ چلتی یوں لڑائی میں نہ پڑنا چاہیے
سرجری کے بعد بڑھیا بن کے آئی نوجواں
کہہ رہی تھی عمرِ رفتہ کو پکڑنا چاہیے
ہر گلی میں کھل گئے دس بیس بیوٹی پارلر
شوہروں کی یوں کمائی کو اُجڑنا چاہیے

ریاضؔ احمد قادری

ہیں خدایا کیوں برے احوال پاکستان کے
ہیں قیامت سارے ماہ و سال پاکستان کے
ہیں مسلط کیسے یہ عمال پاکستان کے
کھا گئے ہیں لوٹ کر سب مال پاکستان کے
جب سے میاںؔ، صابریؔ، نصرتؔ یہاں سے چل دئے
ہو گئے ہیں بے سرے قوال پاکستان کے
ڈالروں پہ سود بھی اب ڈالروں میں ہے بڑھا
قرض بڑھتے جاتے ہیں ہر سال پاکستان کے
فون بجلی، گیس، پانی کے بلوں نے ڈس لیا
لوگ ہوں گے کس طرح خوش حال پاکستان کے
لوڈ شیڈنگ، ڈینگی مچھر، بارشیں، سیلاب ہیں
جن کے دم سے لوگ ہیں بے حال پاکستان کے
بن رہے ہیں دیس میں اور جا رہے پردیس ہیں
کتنے معیاری ہوئے فٹ بال پاکستان کے
جن کی سوچوں نے ہمیں لیکر دیا یہ ملک ہے
ہیں کہاں اب قائد اور اقبال پاکستان کے
قائدِ اعظم نے ملکِ سبز تھا لے کر دیا
ہو گئے دیوار و در کیوں لال پاکستان کے
مر رہے ہیں بم دھماکوں، ڈرون حملوں میں ریاضؔ
کس قدر ارزاں ہوئے ہیں بال پاکستان کے

ریاضؔ احمد قادری

بڑھاپے میں بھی جو عہدِ شباب ڈھونڈتے ہیں
وہ گڑ کے پانی میں موجِ شراب ڈھونڈتے ہیں
حکیم مانو انہیں یا انہیں کہو مجنوں
چنبیلیوں میں جو برگِ گلاب ڈھونڈتے ہیں
ہمیں جو کرنا ہو بے ہوش سب مریضوں کو
تو اپنے گھر سے پرانی جراب ڈھونڈتے ہیں
وہ کون لوگ ہیں آئے مرے ولیمے میں
جو آلو گوبھی کی ڈش میں کباب ڈھونڈتے ہیں
وہ کس طرح سے بھلا پاس ہو سکیں گے کبھی
جو امتحان کے اندر کتاب ڈھونڈتے ہیں
ملے گی کس طرح جنت انہیں بتاؤ ذرا
جو قتل کر کے ہمیں اب ثواب ڈھونڈتے ہیں
ریاضؔ کیسے وہ ان جان ہیں زمانے میں
جو تیری آنکھ سے بچنے کی تاب ڈھونڈتے ہیں
ریاضؔ تیغ سے نینوں کا کیا علاج کریں
جو قتل کرتے ہیں پھر بھی نقاب ڈھونڈتے ہیں

نوید صدیقی

عاشقی میں پھنسا لیا خود کو
کیسے رستے پہ لا لیا خود کو

تن کے بیگم کھڑی ہوئی جس دم
ہم نے فوراً جھکا لیا خود کو

رکھ کے وہ اپنی ہی ہتھیلی پر
پیش کرتی ہے چھا لیا خود کو

جب نہ پائی کہیں سے دادِ سخن
آپ ہی تھپتھپا لیا خود کو

کر نہ پائی کریم تک چٹا
دیکھ روتا ہے کا لیا خو د کو

اس کے ابا کو دیکھتے ہی نوید
ہم نے پاگل بنا لیا خود کو

نوید صدیقی

ضعیف اتنے کہ بکری کو "گاں" سمجھتے ہیں
مگر وہ خود کو ابھی تک جواں سمجھتے ہیں

سکول جاتے انھیں پیٹ درد ہوتا ہے
ہم اپنے بچوں کی بیماریاں سمجھتے ہیں

کنوارے لوگوں پہ کھلتے نہیں یہ راز اکثر
کہ ازدواجی مسائل "میاں" سمجھتے ہیں

سمجھتے ہیں وہ کہا چودھری شجاعت کا
جو گونگوں بہروں کی صاحب! زباں سمجھتے ہیں

سروں پہ قائم ودائم ہے سایۂ بیگم
"اِسی کو اہلِ زمیں آسماں سمجھتے ہیں"

جو ایک شعر لکھے روز وال پر اپنی
ہم اس کو شاعرِ اعظم یہاں سمجھتے ہیں

اب اِن کے بعد وہی آئیں گے جو پہلے تھے
لگی ہوئی ہیں فقط باریاں، سمجھتے ہیں

کسی حسین نے کی ہے تمھاری بھی لتر ول
پڑے ہیں گال پہ کیوں کر نشاں سمجھتے ہیں

خاورؔی

نوٹ اُن کو تھما کے دیکھا ہے
افسروں کو پھنسا کے دیکھا ہے

سارے لیڈر بلا کے جھوٹے ہیں
''ہر طرح آزما کے دیکھا ہے''

کیا ضرورت ہے کیش کی بیگم؟
تُو نے جو مسکرا کے دیکھا ہے

Boss سے بڑھ کے اُس کا Peon ہے
میں نے دفتر میں جا کے دیکھا ہے

جاگتا ہی نہیں ضمیر اپنا
میں نے اس کو جگا کے دیکھا ہے

خاورؔی

اس لیے صورت ہے مرجھائی بہت
ہو گئی ہے پھر سے مہنگائی بہت

کر دیا چپ خوف بیگم نے ہمیں
''تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت''

اُس کے چہرے پر نظر رکتی نہیں
اُس کے چہرے پر ہے چکنائی بہت

بیوی بس اُس کا تو کچھ مت پوچھیے
ہاں مگر اچھی ہے ہمسائی بہت

ہم نے ہر افسر کو راضی کر لیا
ایک رشوت اپنے کام آئی بہت

شعر تو استاد اچھا ہے مگر
ایک مصرع کی ہے لمبائی بہت

اقبال شانہ

حُسن جب بھی علیل ہوتا ہے
عشق ''انا عُقیل'' ہوتا ہے

یار کے سر پہ ہے یہ منڈلاتا
دل محبت میں چیل ہوتا ہے

سیر کرنے وہ جب نکلتے ہیں
ساتھ عبدالخلیل ہوتا ہے

یہ محبت کا فیض ہے یارو
دل مسلسل ذلیل ہوتا ہے

عاشقی چھوڑ دے اگر صاحب
آدمی خود کفیل ہوتا ہے

بن سنور کے وہ جب نکلتا ہے
اور زیادہ جمیل ہوتا ہے

کیس ہم ہارتے نہیں کوئی
جج ہمارا وکیل ہوتا ہے

شاعری سے علاج کرتے ہیں
جب بھی شانہ علیل ہوتا ہے

اقبال شانہ

تم نے جب چھوڑ دیا ساتھ دواخانے میں
نرس نے تھام لیا ہاتھ دوا خانے میں

وہ بھی آتے ہیں علاج اپنا کرنے کے لئے
روز ہوتی ہے ملاقات دواخانے میں

بن سنور کر وہ چلے آئے عیادت کو مری
مشتعل ہو گئے جذبات دواخانے میں

''ڈاکٹرنی'' کی سمجھ میں نہیں آئی یارو!
غالباً دل کی مری بات دواخانے میں

آپریشن جو کیا پیٹ سے میرے نکلے
سرجری کے کئی آلات دواخانے میں

اُٹھ کے بستر سے کھڑے ہو گئے بیمار سبھی
آپ آئے جو مرے ساتھ دواخانے میں

خوف و دہشت سے بندھی جاتی ہے گِھگھی شانہ
شب کو منڈلاتے ہیں جنات دواخانے میں

احمد علی برقیؔ اعظمی

ہمت نہیں کسی میں ہے اُس سے سوال کی
" وہ تیس سال سے ہے وہی بیس سال کی"

کب کہہ دے کیا وہ اس کا کسی کو نہیں پتہ
کرتی ہے بات اپنے وہ جاہ و جلال کی

ڈر ہے کہیں نہ کھینچ لے اپنی زبان سے
سب کو لگی ہے فکر فقط اپنی کھال کی

طاری ہے اُس پہ ایسا نشہ عز و جاہ کا
کوئی نہیں ہے فکر عروج و زوال کی

جو کہہ رہی ہے اُس کا نہ سر ہے نہ پیر ہے
اُس کو نکالنی ہے فقط کھال بال کی

سب دم بخود تھے دیکھ کے اُس کا یہ طمطراق
دل میں مجال ہی نہ رہی عرضِ حال کی

میرا جنونِ شوق بھی آیا نہ میرے کام
تصویر بن کے رہ گیا حُزن و ملال کی

کیسے دوں اس دروغ بیانی کا میں جواب
چھپوادی اُس نے میرے خبر انتقال کی

اب آپ اُس کی دیدہ دلیری تو دیکھئے
کہتی ہے اپنی فکر کرو چال ڈھال کی

خواب و خیال میں بھی نہ تھا جو گذر گیا
برقیؔ مجھے تو فکر ہے اپنے مآل کی

احمد علوی

آپ کی نظروں نے سمجھا ووٹ کے قابل مجھے
ڈاکوؤں اور رہزنوں میں کر دیا شامل مجھے

ماشاء اللہ آج تو تعلیم کا ہوں میں وزیر
کم از کم اب تو نہ کہیے ان پڑھ و جاہل مجھے

توڑ دی ہیں میری ٹانگیں اُس کے ابا جان نے
اب بھی محبوبہ سمجھتی ہے مری کامل مجھے

دل بدلنے کے لئے مجھ کو ملے ہیں دس کروڑ
دل کی اے دھڑکن ٹھہر جا مل گئی منزل مجھے

کل میں ڈرتا تھا پولس سے اب ڈرے مجھ سے پولس
زندگی کی ساری خوشیاں ہو گئیں حاصل مجھے

پھر تو کر سکتا ہوں میں بھی چار سے چھ شادیاں
ساتھ میں بیوی کے مل جائیں اگر دو مِل مجھے

منیر انور

اُس نے کس درجہ محبت سے بنایا حلوہ
یار لوگوں نے چٹا چٹ میں اڑایا حلوہ

صرف تصویر دکھا کے ہی کیا خوش اُس نے
کب ستم گر نے بھلا ہم کو کھلایا حلوہ

روح پر چھا گیا الفت کا نشہ جب اُس نے
اک چمچ بھر کے مری سمت بڑھایا حلوہ

اُن سے رکھنی تھی بنا کر یہ ضروری تھا بہت
جب بھی مکھن نہ ملا ، ہم نے لگایا حلوہ

اس نے دے ڈالی تو ہے دعوتِ حلوہ لیکن
یہ بنایا ہے نہ جانے کہ چرایا حلوہ

کیسے بتلائیں تھا کیا حال ہمارا انور
دور ہی دور سے جب اس نے دکھایا حلوہ

نور جمشید پوری

محلے کا بیچارہ کس لئے جی؟
رہا اب تک کنوارا کس لئے جی؟

محبت کرنے والے چاہتے ہیں
سمندر کا کنارا کس لئے جی؟

نہیں آتا مجھے جب تیرنا تو
سمندر میں اُتارا کس لئے جی؟

سمجھ جاؤ کہ میڈم سے میاں کو
پڑا تھپڑ کرارا کس لئے جی؟

پرانی ہو چکی تھی دال کل کی
اِسے پھر سے بھگارا کس لئے جی؟

جو کہنا ہے کہو بہرے نہیں ہیں
یہ گونگوں سا اشارا کس لئے جی؟

وطن وہ لوٹ کھائیں، اور ہمارا
غریبی میں گزارا کس لئے جی؟

محبت ہو رہی ہے واٹس ایپ پر
پڑے خالی شکارا کس لئے جی؟

محلے میں ہمیشہ نور سے ہی
وہ مانگے ہے غرارا کس لئے جی؟

محمد ظہیر قندیل

وطن فروشی کا جن ہی پکڑ کے دیکھتے ہیں
یہ اِک چراغ ملا ہے، رگڑ کے دیکھتے ہیں

سنا تھا لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
وہ کل کی بات تھی اب بانہہ پکڑ کے دیکھتے ہیں

بڑی ہی آس تھی ہم کو نئی حکومت سے
بہت ہی پھیل گئے تھے، سکڑ کے دیکھتے ہیں

لکھا فسانہ تو کہنے لگے مرے کردار
بہت سنبھال چکے اب بگڑ کے دیکھتے ہیں

وہ سربراہ اِسی محکمے کا تھا کل تک
سنا ہے اب اسے سب ہی اکڑ کے دیکھتے ہیں

سنا ہے سبسڈی ہے میٹرو کرائے پر
سو اپنے شہر سے کچھ دن اجڑ کے دیکھتے ہیں

بہت ہی صلح صفائی سے ہم رہے گھر میں
پروگرام یہی ہے، جھگڑ کے دیکھتے ہیں

شہزاد قیس

روٹی پہ آڑو رَکھ کے پکانا پڑا مجھے
کچھ یوں پکا کہ پیزا منگانا پڑا مجھے

دو یار سُن رہے تھے کہ تین اور آ گئے
پانی غزل میں اور بڑھانا پڑا مجھے

مہماں فروٹ لائے تو چاقو تو میرا تھا
اَخبار بھی زَمیں پہ بچھانا پڑا مجھے

ہونی سے بہت بھاگا پر اَفسوس ایک دِن
شوہر سے اُس کے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

دِل میں بٹھاتا یار کو پر دِل میں کوئی تھا
کچھ روز اُس کو منہ میں بٹھانا پڑا مجھے

پانی کی آدھی بالٹی اور اہلِ غسل چار
مجبوری میں چراغ بجھانا پڑا مجھے

کانوں میں چابی پھیرتے دیکھا جو بار بار
اِخلاقاً اُس کو دَھکا لگانا پڑا مجھے

زَنجیرِ عدل چور کی بکری کو مل گئی
بچوں سے لے کے باجا بجانا پڑا مجھے

جج نے کہا، صفائی میں کچھ ہے تمہارے پاس
سونے کا اُس کو دانت دِکھانا پڑا مجھے

باقاعدہ وُہ دیر سے آنے لگا تھا قیسؔ
دِلبر کو سرخ کارڈ دِکھانا پڑا مجھے

رحمان حفیظ

اگرچہ ذہن میں اک قافیہ کمال کا تھا
گمان اس پہ مگر ذم و ابتذال کا تھا

جنابِ صدر سے پھینٹی اگرچہ کھانی پڑی
مگر جو شعر ہوا تھا بڑے کمال کا تھا

بھلی سی آئی ڈی تھی اور بھلی سی ڈی پی تھی
میں جس کو نار سمجھتا رہا وہ بالکا تھا

ستم تو یہ ہے کہ اس نے بھی ہم کو لوٹ لیا
جو ڈاکٹر کسی خیراتی ہسپتال کا تھا

عجیب طور کا محبوب مل گیا تھا ہمیں
کہ اُس کی آنکھ تھی طوطے کی ، تن غزال کا تھا

حرام ہو گیا میری لڑائی کی خاطر
مگر میں خوش ہوں کہ مرغا مرا حلال کا تھا

سو اب مسوڑے میں تنکا چبھا کے روتے رہو
تمہیں بھی شوق بہت دانت میں خلال کا تھا

ہمارے پاس کی کچھ جائیداد تھی ہی نہیں
بس اک پلاٹ تھا جو صرف سو کنال کا تھا

عطائیوں کی دکانوں پہ دھکے کھاتے پھرے
جن اہلِ عشق کو دھڑکا شبِ وصال کا تھا

مرے علاوہ بھی سب نے سخن کئے لیکن
بس ایک فرق تھا جو ندرتِ خیال کا تھا

نہ جرمِ راہزنی تھا نہ یہ ڈکیتی تھی
عجیب کیس یہ تسخیر با ا لجمال کا تھا

محمد شہزاد قمر آسی

میرڈ دکھائی دے نہ ، کنوارا دکھائی دے
ایف بی پہ ہم کو صرف بے چارہ دکھائی دے

قیمت میاں نے دیکھی ہے بیگم کے سوٹ کی
کیسے نہ اس کو دن میں بھی تارا دکھائی دے

ہلکا کوئی بھی سوٹ نہ بیگم کو بھائے ہے
اس کو فقط وہ مہنگا شرارہ دکھائی دے

کیسے بتائے حسن و جمالِ صنم ،جسے
بہتی سی ناک ،اسمیں غبارہ دکھائی دے

دے دوں تجھے اُدھار بڑے شوق سے مگر
خدشہ مجھے ہے، تُو نہ دوبارہ دکھائی دے

دے دے اُدھار شوق سے اپنے رقیب کو
چاہتا ہے تُو،اگر نہ دوبارہ دکھائی دے

دیکھا نہ کوئی آج تلک خوش نکاح سے
ہر ایک مرد زوج کا مارا دکھائی دے

جس کو سکون چاہیے، بیگم کی مان لے
دوڑے اُدھر ،جدھر کا اِشارہ دکھائی دے

بیگم بُلائے پیار سے ، مجھ کو مرے خدا
ایسا کبھی قمر کو نظارہ دکھائی دے

غضنفر علی

یوں ٹیکسٹ فیس بک پر تو گڈ مارننگ کا ہے
پھر اس کے بعد سامنا گھر فائرنگ کا ہے

بیوی سے ڈر کے کرتے ہیں سیٹنگز پرایویٹ
کہتے ہیں پھر یہ وقت میری ڈارلنگ کا ہے

اپ لوڈ پکس کر لی ہیں کترینہ کیف کی
درپیش مسئلہ تو ابھی ہائڈنگ کا ہے

شعروں کو میرے کرتے ہیں لائک کبھی کبھی
پوچھا تو بولے پرابلم اک رائٹنگ کا ہے

دعویٰ ہے فیس بک پہ بڑا ٹیسٹ میچ کا
حالانکہ کھیل انکا فقط اک اننگ کا ہے

طاہر محمود

شب برات کی سوچ میں بیٹھا، ایک پٹاخہ سوچ رہا تھا
صبح "بناکا" کر آیا تھا، شام "بناکا" سوچ رہا تھا

جیکٹ میں نے پہن رکھی ہے، بم باہر گاڑی میں پڑا ہے
ایک دھماکہ کر آیا تھا، ایک دھماکہ سوچ رہا تھا

چھت ڈلوانے سے پہلے ہی ساون شہر میں آ دھمکا ہے
نالی میں نے بنوا لی تھی، اب پرنالہ سوچ رہا تھا

حاکم بھائی! بھتوں کے کچھ ریٹ مناسب کر ڈالو نا
کچھ بھتے میں لے آیا تھا، ایک میں بھتہ سوچ رہا تھا

فیملی پلاننگ والے یارو! سب شیطان کے بھائی ہیں
دس کاکے میں کر آیا تھا، ایک میں "کاکا" سوچ رہا تھا

میری گلی سے اس کے گھر تک کل ملا کے تین تھے ناکے
دو ناکے میں "ٹپ" آیا تھا، ایک میں ناکہ سوچ رہا تھا

پچھلے ڈاکے سے تو ٹوٹل پندرہ لاکھ ہی بچ پائے تھے
ایک میں ڈاکہ مار آیا تھا، ایک میں ڈاکہ سوچ رہا تھا

مسعود قاضی

یوں تو کُل دنیا ہے فانی ،جی کے دیکھ
"اوکلا ھوما" کا پانی پی کے دیکھ

ایک دم بندہ بنا دے گی تُجھے
ساتھ میں رہ کر ، کسی بندی کے دیکھ

ایک دن تیری بھی شامت آئے گی
دور سے تب تک مزے شادی کے دیکھ

منہ سے کہنا کیا ضروری ہے بھلا ؟
میری آنکھوں میں سُخن گالی کے دیکھ

اُسکے آگے وسکی اور دارُو ہے کیا ؟
فاقہ مستوں میں نشے رُوٹی کے دیکھ

زبیر قیصر

یہی اچھا لگا مجھ کو ، ذلالت چھوڑ دی میں نے
چلن دیکھا شریفوں کا ، شرافت چھوڑ دی میں نے
عوام الناس کو جس نے گھسیٹا روڈ پر لا کر
وہی اب کہہ رہا ہے کہ ذلالت چھوڑ دی میں نے
وہ جس نے لوڈ شیڈنگ کی اسے بیگم نے کوسا ہے
سو اب گنجی حکومت سے شکایت چھوڑ دی میں نے
میں جس میں رہ رہا تھا اس کی بنیادیں بھی خود کھودیں
مگر گرنے سے پہلے وہ عمارت چھوڑ دی میں
حلف اُس نے اٹھایا تو یہی فرماں کیا جاری
حکومت اب کروں گا میں ، سیاست چھوڑ دی میں نے
مجھے کچھ بھی نہیں لینا ، حسابوں سے ، کتابوں سے
سو انگریزی پڑھوں گا میں ، ریاضت چھوڑ دی میں نے
مجھے جب اس کے ابے نے کیا تھانے میں لتر ول
بشیراں کی محبت میں ، محبت چھوڑ دی میں نے
اب اس کے گھر ٹیوشن کی لگی ہے نوکری میری
جو چپکے سے میں کرتا تھا زیارت چھوڑ دی میں

ہاشم علی خان ہمدم

میں اپنی وال پر پکچر پرانی لے کے آیا ہوں
پرانا فیس بکیا ہوں ، جوانی لے کے آیا ہوں

اگرچہ بیویاں دو اور بھی ہیں گھر چلانے کو
مگر جو راج کرتی ہے وہ رانی لے کے آیا ہوں

پکڑ لی نان نفقے میں مرے سسرال نے پنشن
لٹا کے جمع پونجی سب زنانی لے کے آیا ہوں

مجھے پشتو نہیں آتی ،اسے اردو نہیں آتی
سو میں بھی عقدِ ثانی میں پٹھانی لے کے آیا ہوں

مری اوقات سے باہر ہیں تازہ بھنڈیاں لینا
یہ سبزی تو نہیں گھر میں گرانی لے کے آیا ہوں

پئیں گے آج میلے میں یہی دیدار کا شربت
وہ چینی لے کے آئی ہے، میں پانی لے کے آیا ہوں

مجھے امید ہے قسطوں میں گاڑی بن ہی جائے گی
ابھی کچھ کیل پرزے اور کمانی لے کے آیا ہوں

اسدؔ قریشی

درد کی رات اور تنہائی
میری بیوی نہ لوٹ کر آئی

کہہ کے میٹنگ کا وہ گئی لیکن
رات آدھی ہے ہونے کو آئی

دیکھ کر دنگ رہ گیا میں تو
اس کی دفتر میں تھی جو زیبائی

تم کو شکوہ ہے کم لباسی کا
بھائی دیکھو ذرا یہ مہنگائی

میرا گھر نالے کے ہے پچھواڑے
چلتی رہتی ہے مست پُروائی

چھت ٹپکنے لگی جو بارش میں
بیوی سارے ہی پانڈے چک لائی

نوید ظفر کیانی / جیروم کے جیروم

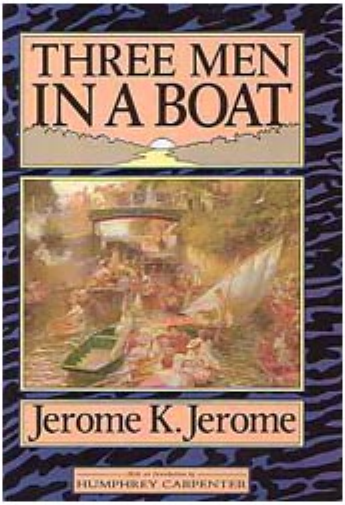

سفر ہے شرط
(باب چہارم)

اِس کے بعد بات پہنچی تری جوانی تک یعنی کھانے پینے کی اشیاء کی باری آئی۔ جارج بولا۔۔۔ ''چلیں، گفتگو کا آغاز ناشتے سے کرتے ہیں!'' (جارج اس معاملے میں بہت پریکٹیکل ہے) ''جہاں تک ناشتے کا تعلق ہے تو اس کے لئے ہمیں فرائنگ پین کی ضرورت پڑے گی۔۔۔!!''

اس موقع پر ہیرس نے مداخلت کی اور ارشاد فرمایا کہ یہ تذکرہ ہضم ہوتا نظر نہیں آتا لیکن اسی موقع پر ہم نے بھی بیک وقت اُس سے کہا کہ گدھے مت بنو اور خاموشی سے سنو، چنانچہ وہ گدھا بننے سے باز آ گیا اور چُپکا ہو رہا۔

جارج نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''ایک چائے دانی، دودھ دانی، چینی دانی اور ایک عدد چولہا، میتھلیٹڈ سپرٹ والا۔۔۔ کیا خیال ہے سجنو؟'' اتنی بات کہہ کر وہ ٹھہر گیا اور پھر تنبیہاً کہا۔۔۔ ''اور پیرافن تیل کا تو ذکر بھی نہیں کرنا!!''

ہیرس اور میں فوراً اُس کی اس بات پر متفق ہو گئے۔ ایک بار سفر پر ہم تیل کا چولہا لے کر گئے تھے لیکن پھر زندگی بھر کے لئے توبہ کر لی تھی۔ سفر کے دوران پورا ہفتہ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے ہم کسی تیلی کی دوکان میں رہ رہے ہوں۔ تیل بہہ نکلا تھا۔۔۔ میں نے اس سے قبل کبھی پیرافین تیل کو بہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے اُسے کشتی کی ناک والے حصے میں رکھا ہوا تھا جہاں کی بود و باش اُسے کچھ خاص پسند نہیں آئی اور تیل بھائی پہیہ لگا کر بہہ نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری کشتی میں نفوذ فرما گئے۔ جو شے ان کے رستے میں آئی من و تو کے فرق سے مبرا ہو گئی، حتیٰ کہ یہ موصوف بہتے ہوئے دریا میں بھی اُتر گئے۔ اچھے خاصے نظارے پر پانی پھر گیا۔ دریا کا سارا پانی آلودہ ہو کر رہ گیا۔ عالم یہ ہو گیا کہ کبھی شرقی تیل گزیدہ ہوا چلتی تو کبھی غربی، کبھی شمالی ہوا تیل میں غسل کرتی ہوئی آتی تو کبھی تیل سے آغشتہ جنوبی ہوا تھاہ کر کے سینے سے لگتی۔ ہوائے زمہریر ہو یا صحراؤں سے اُٹھتی ہوئی صرصر، سب پر تیل کی مہک سواری کرتی ہوئی محسوس ہوتی۔

پیرافین تیل کی مہکار ڈوبتے ہوئے سورج میں بھی سرایت کر گئی تھی، حتیٰ کہ چاند کی چاندنی سے بھی پیرافین جھلکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب ہم طویل سفر طے کر کے مارلو پہنچے تو جانا کہ شائد اس سے چھٹکارا حاصل ہو گیا ہے۔ ہم نے کشتی کو پُل کے بغلی ستون کے ساتھ باندھا اور پیرافن سے نجات حاصل کرنے اور تازہ ہوا میں سانس لینے کے لئے قصبے کا رُخ کیا، لیکن اس ظالم نے ہمارا کھیڑا نہ چھوڑا۔ تمام قصبہ تیل میں ڈوبا ہوا محسوس ہوا۔ ہم چرچ کی چہار دیواری کے نزدیک پہنچے تو یوں محسوس ہوا کہ وہاں کے عبادت گزار لوگوں نے پیرافین تیل کی خوشبو کو عطر جان کر اُسے اپنے اوپر چھڑکا ہوا ہے۔ ہائی سٹریٹ تیل میں ڈوبی ہوئی محسوس

ہوئی۔ ہمیں حیرت تھی کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو تیل کی اس قدر بدبو میں رہ پا رہے ہیں۔ ہم برمنگھم کے راستے پر میلوں چلتے گئے لیکن لاحاصل، یوں لگتا تھا کہ جیسے راستے کے ہر مظہر نے تیل کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو۔

اِس سفر کے اختتام پر قریباً نصف شب کے کسی لمحے، ایک نہایت سنسان مقام پر، بھڑکتے ہوئے چناروں کے سائے میں ہم تینوں نے ایک نہایت خوفناک حلف اٹھایا (اگرچہ اس پورے ہفتے کی ایک ایک ساعت، ایک ایک پل ہم صلواتیں سناتے رہے لیکن باقاعدہ اور سنجیدہ ترین حلف کا موقع وہیں آیا تھا۔) اور وہ حلف یہ تھا کہ ہم نے کسی بھی زمانے کے کسی بھی سفر میں اپنے زادِ راہ میں پیرافن تیل کو ہرگز ہرگز نہیں رکھنا۔ چنانچہ اسی عہد کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے میتھلیٹڈ کیک کو پیرافن تیل پر ترجیح دی۔ اگرچہ میتھلیٹڈ سپرٹ میں بھی کچھ بُرائیاں بہرحال موجود تھیں لیکن کم از کم اس کے سسٹم میں پیرافن تیل کی طرح کا لیچڑپن موجود نہیں تھا۔

ناشتے کے دوسرے لوازمات کے سلسلے میں جارج نے انڈوں اور بیکن کو ترجیح اشیاء میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی کیونکہ نہ صرف اُنھیں تیار کرنا آسان ہوتا ہے بلکہ اس کے ساتھ جو اشیاء استعمال ہونی ہوتی ہیں، ہمارے ووٹ اُنھیں اشیاء کو پڑتے ہیں یعنی خنک گوشت، چائے، ڈبل روٹی اور جام۔

''دوپہر کے کھانے کے لئے ہم بسکٹ، خشک گوشت، ڈبل روٹی اور مکھن سے کام چلا سکتے ہیں'' ۔۔۔ جارج نے کہا۔

''جی ہاں ۔۔۔ جام تو ٹھیک ہے لیکن پنیر ہرگز ہرگز نہیں ۔۔۔ پنیر کے تیل بھی پیرافن تیل جیسے ہیں، نچلا بیٹھتا ہی نہیں ۔۔۔ پوری کشتی کو اپنی تحویل میں لے لینا چاہتا ہے۔ یہ بھی خاصی تباہی کا حامل ہے اور کھانے پینے کی ہر شے کو اپنے ذائقہ سے بھر دیا ہے۔ آپ امتیاز ہی نہیں کر پاتے کہ کیا کھا رہے ہیں۔ سیبوں کا مربہ، جرمن ساسج، سٹرابری یا ملائی ۔۔۔ ہر شے پنیر لگتی ہے اور پنیر کی مہک کا کیا پوچھا، یہ بھی اپنے جامے میں سمائے رہنے کی عادی نہیں۔

پنیر کے ذکر پر مجھے اپنا ایک دوست یاد آ جاتا ہے جس نے ایک مرتبہ لیور پول سے کچھ پنیر خریدا تھا۔ بہت عمدہ پنیر تھا، خوب گاڑھا اور نرم اور اس کی مہکار، الامان والحفیظ ۔۔۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی دو سو ہارس پاور کی رفتار سے سفر کرتی تھی۔ تین میل کا فاصلہ چٹکیوں میں طے کر لیتی تھی، دو سو یارڈ کے فاصلے پر موجود بندے پر فوری حملہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔ میں بھی اُس وقت لیور پول ہی میں تھا۔ میرے دوست نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اُس کے پنیر کو لندن پہنچا دوں کیونکہ وہ دو تین دن مزید لندن جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور پنیر کا اتنے طویل عرصہ تک یونہی پڑا رہنا ٹھیک نہیں تھا۔

''اوہ کیوں نہیں ۔۔۔ بسرو چشم'' ۔۔۔ میں نے بڑے خلوص سے حامی بھر لی۔

میں نے پنیر منگوایا اور اُسے بگھی میں لے کر روانہ ہوا۔ یہ چپے برابر سفر بھی خاصی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا۔ بگھی کو ایک ٹٹو نما شے چلا رہی تھی ۔۔۔ چلا کیا رہی تھی، وہ بیچارہ بمشکل گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کی تھوتھنی تقریباً زمین سے لگی ہوئی تھی۔ اگرچہ اُس ٹٹو کا مالک تو جوشِ خطابت میں اُسے ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا قرار دے رہا تھا لیکن قرائن کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔

میں نے پنیر کو اُس پر لادا اور بگھی ہولے ہولے روانہ ہوئی۔ اس پُرسکون روانگی کا سبب غالباً وہ بوجھ تھا جس سے بیچارے ٹٹو کی کمر دوہری ہو رہی تھی۔ یہ قرار اُس وقت تک برقرار رہا جب تک ٹٹو سڑک کے ایک موڑ تک نہیں پہنچ گیا۔ جونہی وہ اُس موڑ پر پہنچا، ہوا کا رخ تبدیل ہوا اور پنیر کی مہک بھرپور اور تندہی سے ٹٹو پر حملہ آور ہوئی جس نے امن وسکون کے رومانس کا ستیاناس کر دیا۔ ٹٹو نے ایک جھرجھری لی اور اگلے ہی لمحے پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا ہو گیا۔ پنیر بھری ہوا کا رُخ بدستور اُسی کی طرف رہا۔ جب تک ہم اُس سڑک کے انت تک نہیں پہنچے، ٹٹو نے اپنی رفتار کم نہیں کی بلکہ چوبیس میل فی گھنٹے کی رفتار تک جا پہنچا۔ اس سلسلے میں اُس نے کسی کے مراتب اور عظمت کا بھی لحاظ نہیں کیا اور سب کو یکساں طور پر چیخنے اور چلانے پر مجبور کیے رکھا۔ اسٹیشن پر تین قلیوں اور

ہی پنیر کو ایک ریک پر رکھ دیا اس کے ساتھ ہی دانت نکوس کر اُن سب افراد پر ایک خیر سگالی سے بھرپور مسکراہٹ پھینکی اور کہا کہ آج موسم کچھ گرم ہے۔

کچھ لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ اُس معزز صاحب کو کچھ بے چینی سی شروع ہوگئی۔

"آپ نے اسے خاصا نزدیک رکھ چھوڑا ہے"۔۔۔۔وہ منمنایا۔

"نہایت نامناسب اور ظالمانہ قدم ہے یہ"۔۔۔۔۔اُن سے اگلا والا شخص بھی رہ نہ سکا۔

اس کے ساتھ ہی دونوں نہایت زور دار انداز میں سونگھنے لگے۔ غالباً پنیر اُن کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک بیقرار رہنے کے بعد وہ یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے پیچھے ٹرین سے اُتر گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نہایت تیز طرار قسم کی خاتون بھی یہ کہتی ہوئی بطور احتجاج اُٹھیں کہ ایک شادی شدہ خاتون کے ساتھ پنیرانہ زیادتی کا رتکاب کرنا نہایت گھمبیر قسم کی غیر اخلاقی حرکت ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے اپنا بھاری بھرکم بیگ اور سات عدد پارسل اٹھائے اور پھنکارتی ہوئی ڈبے سے باہر کود گئیں۔ بقایا پانچ افراد کچھ دیر تک تو بیٹھے رہے لیکن یہ سکون زیادہ دیر برقرار نہیں رہا۔ کونے میں بیٹھے ہوئے ایک معزز شخص، جو اپنے وضع قطع سے خاصے نفیس اور اونچی کلاس سے لگ رہے تھے، بول اٹھے۔۔۔۔۔۔"اس پنیر کی بُو تو ایسی ہے جیسے کوئی مردہ بچہ یہاں رکھا گیا ہو"۔۔۔۔اُن کے اِن کلمات کو سُن کر باقی تینوں افراد بیک وقت ڈبے کے دروازے کی طرف لپکے اور ایک ساتھ نکلنے کی سعی میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور زخمی ہو گئے۔

میں نے ڈبے میں رہ جانے والے واحد نگرو شخص کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے ٹرین پر آ کر غلطی کی ہے، مجھے بگھی ہی پکڑنی چاہیئے تھی۔

اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا اور کہا۔۔۔۔"بعض لوگ معمولی معمولی باتوں کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں!"

ڈرائیور نے نہایت دشواری سے اُسے قابو کیا۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ چاروں بھی اس سلسلے میں بے بس ہو کر رہ جاتے اگر ایک قلی حاضر دماغی کا مظاہرہ نہ کرتا اور ایک رومال اُس کی ناک پر نہ دھر دیتا۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور پنیر اٹھا کر نہایت فاتحانہ انداز سے پلیٹ فارم پر چلنے لگا۔ پلیٹ فارم کے دونوں اطراف میں آتے جاتے افراد میرے یا پنیر کے احترام میں نہایت سراسیمگی کے عالم میں پیچھے کی طرف کھسکنے گئے، گویا اس معاملے میں میں "صف شکن" بن کر رہ گیا تھا۔ ٹرین میں بہت رش تھا۔ میں کسی نہ کسی صورت ایک ایسے ڈبے میں گھسنے میں کامیاب ہو گیا جہاں پہلے ہی سے سات افراد موجود تھے۔ پنیر کی وجہ سے ایک مغرور ہونے کی حد تک معزز شخص نے بھرپور احتجاج کیا اور میرا راستہ روکنے کی بھی کوشش کی لیکن میں پھر بھی "بلیاں دے کر" گھس گیا اور جاتے

ظاہر تو وہ خود کو پرسکون کر رہا تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی کسی اندرونی بےچینی کا شکار ہے اور اس بےچینی کے ڈانڈے یقیناً میرے والے پنیر ہی سے ملتے تھے۔ میں نے اُسے مشروب پینے کی دعوت دی جو اُس نے نہایت خندہ پیشانی سے قبول کر لی۔ ہم دونوں نے ہجوم کا سینہ چیرتے ہوئے بفے کا رخ کیا اور کافی دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں محو رہے۔ اسی اثناء میں ایک خاتون نے آکر پوچھا کہ ہم کیا لینا پسند کریں گے؟

''کیا خیال ہے دوست؟'' میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''ایک پیگ برانڈی۔۔۔نیٹ''۔۔۔اُس نے اپنا آرڈر پلیس کیا۔

مشروبات سے فارغ ہو کر وہ چپ چاپ اٹھا اور کسی دوسرے ڈبے کا رخ کیا۔ بڑا ہی کم ظرف نکلا نیگرو کا بچہ!!

ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں نے وہ والا سارا ڈبہ بک کر رکھا ہو۔ یہ بات نہیں تھی کہ مسافروں کی کمی ہو گئی تھی۔ ٹرین مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ جونہی ٹرین راستے میں ایک مختلف سٹیشن پر رُکی، اور مسافروں نے میرا خالی ڈبہ دیکھا تو اُمڈ پڑے۔

''یہ رہا ایلزی۔۔۔اِدھر! جلدی کرو''۔۔۔کوئی چلایا۔۔۔''یہاں کافی جگہ ہے!! ٹمی، بس ہم نے یہیں بیٹھنا ہے۔۔۔!''

اس کے ساتھ ہی وہ سب دروازے پر ظاہر ہوئے، بھاری بھرکم بیگ اُن کے کاندھے پر لدے ہوئے تھے۔ وہ سب بیک وقت اندر داخل ہونے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ بالآخر اُن میں سے ایک شخص اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ سیڑھیوں پر پھدکتا ہوا جس تیزی سے وہ اندر داخل ہوا اُسی سرعت سے واپس پلٹ گیا اور اپنے سے پیچھے آنے والے شخص پر جا پڑا۔

باری باری بہت سے لوگ ڈبے میں داخل ہوئے اور لیکن جونہی پنیر کی خوشبو اُن کی مشام پر حملہ آور ہوتی، وہ واپس پلٹ جاتے۔ یوں میں نے سارا سفر تنِ تنہا سرانجام دیا۔

ایوسٹن پہنچ کر میں نے پنیر اٹھایا اور حسبِ ارادہ اپنے دوست کے گھر جا پہنچا۔ نوکروں نے مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔ کچھ دیر بعد جب میرے دوست کی بیوی ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی تو اُس نے دو تین لمبے لمبے سانس کھینچے اور بولی۔۔۔''یہ کس چیز کی بو ہے!''

میں بولا۔۔۔''یہ بو نہیں خوشبو ہے، پنیر کی خوشبو، ٹام نے بوسٹن سے خریدا تھا اور مجھ سے کہا تھا کہ میں اسے یہاں پہنچا دوں۔''

اس کے ساتھ ساتھ میں اپنی صفائی پیش کرنا نہیں بھولا کہ وہ میرے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی کو دل میں جگہ نہ دے، میرا پنیر کی خریداری سے کوئی تعلق نہیں۔ ٹام کی بیوی نے مجھے تسلی دی کہ وہ میرے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تاہم جب ٹام واپس لوٹے گا تو اُس سے باز پرس ضرور کرے گی۔

لیورپول میں میرے دوست کا قیام طول کھینچا چلا گیا اور وہ متوقع دورانیے میں واپس نہ آسکا۔ تین دنوں بعد بھی جب ٹام واپس نہ آیا تو اُس کی بیوی نے دوبارہ مجھے بلا بھیجا۔

''ٹام نے پنیر کے بارے میں اور کیا کہا تھا؟'' اُس نے پوچھا۔

میں نے اُسے بتایا کہ ٹام نے مجھے ہدایت دی تھی پنیر کو خنک جگہ پر رکھا جائے اور اُس کی واپسی تک کوئی اُسے ہاتھ نہ لگائے۔

''ہاتھ لگانا تو ایک طرف رہا، کوئی اسے سونگھنا بھی پسند نہیں کرے گا''۔۔۔اُس کی بیوی نے کہا۔۔۔''کیا ٹام نے اِسے سونگھ کر بھی دیکھا تھا؟''

''جی بالکل۔۔۔اُس نے نہ صرف سونگھا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ اُس کی خوشبو نے اُس کا دل ہی موہ لیا ہے!''

''کیا خیال ہے آپ کا؟'' اُس کی بیوی نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا ''ٹام کا کیا ردِّعمل ہو گا اگر میں اس پنیر کو کسی شخص کے حوالے کر دوں کہ وہ اسے کہیں دور جا کر پھینک آئے؟''

''ایسا ہرگز ہرگز نہ کیجئے گا! ٹام اِسے قطعاً پسند نہ کرے گا!''

اُس نے ایک اور تجویز پیش کی، وہ بولی ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے دوست کی خاطر کچھ عرصہ کے لئے اسے اپنے

پاس رکھ لیں۔۔۔ٹام کی واپسی تک۔۔۔آپ اجازت دیں تو میں اِسے آپ کے گھر پہنچانے کا انتظام کردوں؟"

"محترمہ! محترمہ!!" میں نے جلدی سے کہا "جہاں تک میرا تعلق ہے تو مجھے پنیر کی مہک سے کوئی الرجی نہیں، بلکہ مجھے تو یہ بہت اچھی لگتی ہے، میرا لیورپول سے یہاں تک کا سفر پنیر کی معیت میں طے ہوا تھا اور میرے لئے یہ ایک نہایت خوشگوار تجربہ رہا تھا۔ میں اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا رہا تھا لیکن کیا کیا جائے، ہمیں دوسروں کو بھی دیکھنا پڑتا ہے! میں جس مکان میں رہتا ہوں اُس کے نچلے والے پورشن میں جو خاتون رہتی ہیں وہ نہ صرف بیوہ ہیں بلکہ جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے، تو خاصی یتیم بھی ہیں۔ وہ پنیر پر نہایت جارحانہ تحفظات رکھتی ہیں۔ آپ کا پنیر اگر وہاں رکھا گیا تو پھر پتہ نہیں کیا ہوگا اور مجھے آئندہ کے لئے خود کو کہاں رکھنا پڑے گا!!"

"ٹھیک ہے"۔۔۔میرے دوست کی بیوی اٹھتے ہوئے بولی "تو پھر اس کے سوا میرے پاس اور کیا چارہ رہ جاتی ہے کہ اپنا سامان پیک کروں، اپنے بچوں کو اٹھاؤں اور کسی ہوٹل میں منتقل ہو جاؤں اور اُس وقت تک وہیں رہوں جب تک یہ پنیر ہڑپ نہ کرلیا جائے، چاہے یہ کام آپ کا دوست خود کرے یا اس کے لئے وہ کسی بیرونی امداد کا بندوبست کرے، اب میں آپ کی بیوہ اور یتیم خاتون کو کسی راست قدم اٹھانے پر مجبور کرنے سے تو رہی!"

اور اُس نے ایسا ہی کیا۔۔۔مکان کو ایک بوڑھی خاتون کے سپرد کردیا گیا لیکن اس ضمن میں بھی اُس نے شرافت کے سارے تقاضے نباہے، نوکرانی سے پوچھا کہ کیا وہ پنیر کی بدبو کو برداشت کر لے گی تو اُس نے جواباً پوچھا، کون سی بدبو؟؟ جب نوکرانی کو پنیر کے پاس لے جایا گیا اور اُس سے طویل سانس اندر کھینچ کر سونگھنے کے لئے کہا تو اُس نے پنیر کی خوشبو سونگھی اور کہا "ارے! یہ تو تربوز کی مہک ہے، کیا بھینی بھینی خوشبو ہے!! ٹام کی بیوی نہایت اطمینان سے رخصت ہوگئی۔

بعدازاں ٹام نے مجھے بتایا کہ اُسے پنیر کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ بشمول ہوٹل کے مصارف پنیر کی قیمت ساڑھے آٹھ پونڈ سے بھی تجاوز کرگئی۔ پنیر سے اُس کی ازلی اور والہانہ وابستگی اپنی جگہ لیکن ایسے پنیر کی محبت کا کیا کیا جائے جو اُس کی قوتِ خرید سے بھی باہر نکل جائے چنانچہ اس سے پہلے کہ اُس کی قیمت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا، ٹام نے اُس سے نجات حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا اور اُسے ایک ندی میں جا پھینکا لیکن پھر مزدوروں کی مدد سے اُسے وہاں سے دوبارہ نکلوانا پڑا کیونکہ وہاں کے گنے بڑھ مچھیروں نے موقعِ واردات پر ہی اعتراض کرنا شروع کردیا تھا کہ پنیر کی بدبو نے اُن کے حواسوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے بعد ایک تاریک اور بھیانک رات کو اُس نے پنیر کو گاڑی میں لادا اور شہر سے دور ایک ویران اور اجڑے ہوئے مردہ خانے میں اُسے ٹھکانے لگانا چاہا لیکن وہاں متعین یک فریقی عملے نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا اور اُسے دہشت گردی کی سازش سے تعبیر کیا۔ اُس نے الزام لگایا کہ ٹام پنیر کو وہاں اس لئے ٹھکانے لگانا چاہتا ہے تاکہ وہاں مدتوں سے خوابیدہ بھوتوں کو برانگیختہ کیا جائے اور اُس کو وہاں سے دربدری پر مجبور کیا جائے۔

آخر کار میرا دوست پنیر سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ اُسے قصبے سے دور دریا کے کنارے لے گیا اور وہیں ساحل پر ایک جگہ زمین کھود کر دفن کردیا۔ پنیر کی وہاں تدفین کے بعد اُس علاقے کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ زائرین کا کہنا تھا کہ وہاں سے اچانک ایک نہایت پُراسراری مہک آنے لگی ہے جس کا اس سے قبل نام ونشان بھی نہ تھا۔ وہاں ہر وقت عقیدتمندوں کا اژدھام رہنے لگا اور لوگ اپنے عقیدے کی پختگی کے لئے مدتوں جوق در جوق آتے رہے اور فیض پاتے رہے۔

اِسی مثال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے پنیر سے متعلق اپنے جذبات کا گلہ گھونٹ دیا اور جارج کی بات مان لی کہ اس سفر میں پنیر کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ ترک کردیا جائے۔

"چائے کے لوازمات کی ضرورت نہیں"۔۔۔جارج نے کہا (یہ سُن کر ہیرس کا چہرہ جس تیزی سے فق ہوا وہ لائق دید تھا) "لیکن ہمیں شام سات بجے تک ایک تگڑے قسم کا ڈنر، چائے اور

رات کا کھانا یکمشت کھالیا کریں گے۔''

ہیرس کا چہرہ از سرِ نو کھل اٹھا۔ جارج کھانے کی اشیاء گنوانے لگا۔۔۔ گوشت، پھل، خشک گوشت کے پارچہ جات، ٹماٹر اور کچھ ہری سبزیاں، پینے کے لئے ہیرس کی خصوصی ایجاد کردہ مشروب، جس میں اگر پانی ملا لیا جائے تو وہ لیموں کا شربت جیسا بن جاتا ہے، چائے اور ایک بوتل وہسکی کی، آخر بندہ کبھی کبھار اپ سیٹ بھی تو ہو سکتا ہے۔

ہم نے محسوس کیا تھا کہ جارج اپ سیٹ ہونے کے بارے میں بہت حساس ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اُس کے اندر کوئی غلط قسم کی شاعرانہ روح حلول کر گئی ہو لیکن پھر بھی مجھے ''وہسکی'' کی زادِ راہ میں شمولیت پر خوشی ہوئی۔

ہم سفر میں شراب یا بیئر لے کر جانے کے حق میں نہیں تھے۔ دریا کے سفر میں تو اس کا خیال ہی مہا غلطی ہے۔ شراب پی کر انسان خمار میں مبتلا ہو جاتا ہے اور عجیب قسم کی نیستی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ شام کے وقت جب آپ کسی قصبے میں ہوں اور لڑکیوں کو تاڑنے میں مشغول ہوں تو ایک عدد گلاس مناسب لگتا ہے لیکن ایسے میں شراب پینے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہیے جب سورج سوا نیزے پر ہو اور آپ کو ڈھیروں کام کرنا ہو۔

ہم نے اُن اشیاء کی لسٹ بنائی جن کی دورانِ سفر ضرورت پڑ سکتی تھی اور یہ اتنی طویل تھی کہ اسے بناتے بناتے شام پڑ گئی۔ اگلا دن جو جمعہ کا تھا، ہم لوگوں نے اُن تمام اشیاء کا بندوبست کرنا تھا اور پھر شام تک اُنھیں پیک بھی کرنا تھا۔ ہم نے کمرے میں کپڑوں کا ڈھیر لگایا، کھانے پینے کے سامان اور برتنوں کے لئے ایک ریک کا بندوبست کیا۔ اب یہ عالم تھا کہ کمرے کے عین بیچوں بیچ گونا گوں اشیاء کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہم تینوں اپنی اپنی کرسیاں کھڑکی کے پاس اُٹھا کر لے گئے تھے اور اب وہاں سے یک ٹک اُس ڈھیر کو دیکھے جا رہے تھے۔

''پیکنگ میں کروں گا''۔۔۔ میں نے کہا۔

ہر شخص کو کسی نہ کسی کام میں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ پیکنگ ایک ایسا عمل تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ میں اس کام میں

دنیا کے تمام لوگوں سے بہتر طور پر سرخرو ہو سکتا ہوں۔ (بسا اوقات خود مجھے بھی حیرانی ہوتی ہے کہ میں اپنے خیال میں کس کس کام میں یکتا نہیں ہوں) میں نے پیکنگ کا کام اپنے ذمے اس لئے بھی لیا تھا کہ میں اس ضمن میں اپنے دوسرے دو دوستوں کو متاثر کر سکوں۔ وہ ستم ظریف گویا اسی انتظار میں تھے۔ جارج نے اپنا پائپ سنبھالا اور ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ ہیرس نے بھی کرسی پر بیٹھ کر اپنی ایک ٹانگ میز پر جمائی اور سگار کے کش لینے لگا۔ حتیٰ کہ میرا اپنا کتا مونٹمورینسی بھی منہ اٹھا اٹھا کر یوں میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں کوئی تماشہ شروع کرنے والا ہوں۔

میری کھوپڑی سے ایک ہلہلاتی سی لہر نکلی اور پورے جسم میں کوند گئی۔ میری مٹھیاں اور جبڑے بھنچ گئے تاہم میں نے کچھ نہ کہا، چپ ہی رہا۔ ہیرس اور جارج نے جو عمل میرے ساتھ اختیار کیا تھا وہ سراسر میرا تمسخر اُڑانے کے مترادف تھا۔ وہ یوں ظاہر کرنا چاہتے تھے جیسے میں اُن کا ''کاما'' ہوں اور یہ کہ وہ میری سعادتمندانہ ''کاماگیری'' پر بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ میرا مقصود کچھ اور تھا۔ میں دراصل اُنھیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں پیکنگ کے فن میں عدیم المثل ہوں اور اس کے تمام رموز و اسرار سے میں کماحقہٗ واقف ہوں چنانچہ اس سے متعلق جتنے بھی امور ہیں، میری ہدایت کے مرہونِ منت ہیں۔ اس سلسلے میں اُنھیں میرے علم سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے اور میری مدد کرنی چاہیے۔ میں اپنے آپ کو ایک سپروائزر کے روپ میں پیش کرنا

چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالوں اور گھوم پھر کر اُنہیں ہدایات دیتا رہوں کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ وہ دونوں میری ہر بات کو قولِ فیصل تسلیم کریں اور میرے اشاروں پر ناچیں لیکن وہ دونوں تھے کہ میرا جلوس نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ میں تو کام میں لگا ہوا ہوں اور دوسرے آرام کرسی پر بیٹھ کر سگار کے کش لگائیں اور میرا ہاتھ نہ بٹائیں۔

ایک بار مجھے ایک ایسے ہی شخص کے ساتھ رہنا پڑ گیا تھا جسکا طرزِ عمل مجھے غصے سے باؤلا بنا کر رکھ دیتا تھا۔ وہ ایک صوفہ پر ڈھیر ہو جاتا تھا اور بڑے مزے سے بیٹھ کر گھنٹوں مجھے کام کرتا ہوا دیکھتا رہتا تھا۔ اُس کی کاہل نظریں میری ہر ہر جنبش کا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اُسے یہ دیکھ کر بڑا مزا آتا ہے کہ میں پورے کمرے میں ناچتا پھر رہا ہوں اور چیزوں کو ملیامیٹ کر رہا ہوں۔ اُس کا کہنا تھا کہ مجھے یوں کام کرتا ہوا دیکھنا اُسے یہ باور کراتا ہے کہ زندگی ایک تساہلانہ خواب نہیں ہے جسے جماہیوں کی نذر کر دیا جائے بلکہ ایک نیک مقصد ہے، کام کام اور صرف کام۔ اُس کا مزید یہ بھی قولِ زرّیں تھا کہ اُسے خود پر حیرت ہوتی ہے کہ مجھ سے ملنے سے پہلے اُسکا گزارا کیونکر ہو رہا تھا۔ بھلا وہ بھی کوئی زندگی تھی جو کسی کو کام کرتا ہوا دیکھے بغیر گزر گئی تھی۔

خیر صاحب میں بھی نہایت خموشی سے اپنے کام میں جت گیا۔ کام میرے اندازے سے کہیں زیادہ تھا۔ پورے کمرے میں بکھرے ہوئے جن کو تین بیگوں کی بوتلوں میں بند کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا، وانتوں پسینہ آ گیا تاہم آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اگر کام کی کڑوی گولی کو دلچسپی کے لڈو میں ڈال کر نگلا جائے تو ناگواری کا احساس نہیں ہوتا۔ پیکنگ کرنا میری ہابی تھی لیکن اُس وقت میں تغافل کی سیخ پر لٹکا ہوا تھا اس لئے ہر کام میں جھلاہٹ کے شعلے زبان نکال رہے تھے۔ ہر مرحلہ جوئے شیر بنتا جا رہا تھا تاہم ''چلیں تو کٹ ہی جاتا ہے سفر آہستہ آہستہ'' بیس پچیس منٹوں کی ہاتھا پائی کے بعد میں بالآخر تمام چیزیں بیگوں میں ٹھونسنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ آخری بیگ کے منہ کو بند کرتے ہوئے میں نے اُن دونوں کی طرف فاتحانہ انداز سے دیکھا۔ ہیرس نے سگار کا ایک طویل کش لیا اور بڑے آرام سے بولا۔۔۔''کیا تم نے جوتوں کو بیگ میں نہیں رکھنا؟''

میں نے دیکھا کہ اُن دونوں کے جوتے میز کے نیچے پڑے ہوئے تھے۔ میں انہیں پیک کرنا بھول گیا تھا۔ یہ ہیرس بھی اپنی ہی قسم کا گاؤدی شخص تھا۔ بھلا اُس وقت اُسے یہ بات بتلاتے ہوئے کیا تکلیف ہو رہی تھی جب میں نے بیگوں کو بند نہیں کیا تھا۔ میرے چہرے پر جھنجھلاہٹ کی حمرت دیکھ کر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دئے۔ اُن کے قہقہے میری کھوپڑی پر ہتھوڑے کی طرح برس رہے تھے۔ میں غصے کی شدت سے پاگل ہو گیا۔ میں نے بیگوں کو اُٹھا کر فرش پر پٹخا، بیگ سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ یہ غالباً وہ بلوریں ایش ٹرے تھی جو گزشتہ ہفتے میری منگیتر نے مجھے تحفتاً دی تھی۔ میں نے گھبرا کر اُن دونوں کی طرف دیکھا، جارج نے شرارت سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رکھی تھیں، ہونٹوں پر مسکراہٹ کے جھکڑ چل رہے تھے۔ پیکنگ کے سلسلے میں میرے کچھ نظریات تھے۔ میں ہر چیز کو اُن کی موزوں جگہ پر رکھنے کا قائل تھا اور جوتوں کا مقام بیگ کے انتہائی نچلے درجے پر تھا لیکن چونکہ اُس وقت دماغ سے غصے کے شعلے اُٹھ رہے تھے اس لئے میں نے اپنے تمام نظریات پر دو دو حرف بھیجے اور جوتوں کو بے محابا قمیضوں والے حصے میں ٹھونس دیا۔

''ذرا احتیاط سے جے!'' ہیرس نے کہا ''جوتوں کے نشان قمیضوں پر پڑ گئے تو لوگوں کو باور کرانا مشکل ہو جائے گا کہ ہم شادی شدہ نہیں!!''

اِس بار ہنسنے کی باری موٹمورینسی کی تھی۔ اُس نے اپنی تھوتھنی اوپر کی طرف بلند کی اور ''بھوں اوں وں وں'' کی ایک لمبی سی ہانک لگائی۔ میں نے ایک جھٹکے سے بیگ کی زپ کھینچی اور اُس کا منہ بند کر دیا۔ دونوں بیلیوں کی بتیسیاں اب تک موٹمورینسی کی جگت کا حظ لے رہی تھیں۔ اُن کے دانتوں پر نظر پڑی تو اچانک ایک بھیانک خیال میرے ذہن میں سرایت کر گیا۔ کیا ''ٹوتھ برش'' بھی پیک کئے جا چکے ہیں؟ شکوک و شبہات کے بلوئے نے

مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔۔۔ ''نہیں! وہ تو شائد میں نے پیک ہی نہیں کیے!!''

یہ ٹوتھ برش بھی ایک ہی مصیبت تھی۔ اس نے سفر سے پہلے اور دورانِ سفر ہمیشہ مجھے تنگ کیا ہے۔ شائد اپنی زندگی کے بعد جس شے کے بارے میں میں نے سب سے زیادہ سوچا ہے، وہ یہی ٹوتھ برش ہے۔ اس بدبخت نے بھی مجھے جی بھر کر ستایا ہے، مجال ہے جو کبھی دورانِ سفر ڈھونڈنے سے ملا ہو۔ قبل از سفر بھی ہمیشہ شبہ ہی رہتا تھا کہ شائد میں اِسے پیک کرنا بھول گیا ہوں۔

ذرا یہ منظر تو تصور میں لایئے کہ سفر سے پہلے رات کو ہی میں پیکنگ کا مرحلہ نمٹا چکا ہوں اور اب لمبی تان کر سونا چاہتا ہوں تا کہ اگلی صبح سفر پر روانگی سے قبل پوری طرح تازہ دم ہو جاؤں۔ نیند کا اُڑن کھٹولا مجھے اُڑا کر خوابوں کے پرستان لے جاتا ہے۔ راجہ اِندر کا دربار لگا ہوا ہے، سیمیں بدن پریاں رقص میں مشغول ہیں۔ میں اس طلسم ہوشربا میں مسحور بیٹھا ہوں کہ اچانک فضا میں ایک درد بھری چیخ گونجتی ہے، چاروں طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔ سب کی نظریں دروازے کی طرف اُٹھتی ہیں۔ میں بھی اپنی نظریں گھماتا ہوں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرا ٹوتھ برش ٹھک ٹھک کرتا ہوا بڑھتا آ رہا ہے۔ میں بے اختیار اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ میرے نزدیک پہنچ کر وہ ٹھہر جاتا ہے اور پھر نہایت درد بھری آواز میں کہتا ہے ''کیوں جے! تم میرے بغیر ہی یہاں چلے آئے؟ مجھے بھول گئے؟؟''

پریاں حیرت سے چیختی ہیں۔۔۔ ''کیا؟ تم اپنا ٹوتھ برش لانا بھول گئے؟؟؟''

راجہ اندر کے چہرے پر غضبناک جلال اُمڈ آتا ہے، وہ اپنی پُر وقار آواز میں دھاڑتا ہے ''مابدولت کیا سُن رہے ہیں؟؟ تم اپنے ٹوتھ برُش کو لانا بھول گئے؟؟؟؟''

راجہ کی خوفناک صدا کی بازگشت چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ آندھیاں چلنے لگتی ہیں۔ محل کے در و بام دھڑا دھڑ بجنے لگتے ہیں۔ میں ایک زوردار چیخ کے ساتھ اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ پورا بدن پسینے سے شرابور ہے، اسی حالت میں اُٹھتا ہوں اور پوری سرگرمی سے تلاش کر کے ٹوتھ برُش بیگ میں ڈال دیتا ہوں، پھر جب سوتا ہوں تو گھنٹوں اپنے آپ کو یاد دھانی کراتا رہتا ہوں کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں، ٹوتھ برش پیک کیا جا چکا ہے۔ علی الصبح اُٹھ کر اُسے دوبارہ بیگ سے نکالتا ہوں تا کہ دانت صاف کر سکوں۔ یہی وہ واحد چیز ہوتی ہے جسے میں آخری بار استعمال کرتا ہوں اور یہی وہ واحد چیز ہوتی ہے جسے میں دوبارہ بیگ میں ڈالنا بھول جاتا ہوں۔ اپنے بیگ کو کندھے پر ڈال کر جب صدر دروازے کو مقفل کرتا ہوں اور تھوڑی دور چلتا ہوں تو اچانک ٹوتھ برُش کا خیال آ جاتا ہے، وہیں زمین پر بیٹھ جاتا ہوں اور بیگ کو اُلٹ پلٹ کر برُش ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ قریب سے گزرنے والے مجھے عجیب سی نظروں سے گھورتے جاتے ہیں۔ بعض نامعقول کوئی اشتعال انگیز فقرہ بھی کس دیتے ہیں لیکن میں کان دبائے اپنے کام میں جتا رہتا ہوں۔ ایکا ایکی یاد آتا ہے کہ وہ تو دانت صاف کرنے کے بعد غسلخانے میں بھول آیا ہوں۔ دروازے کا تالا کھولتا ہوں اور دندناتا ہوا غسلخانے میں جا گھستا ہوں۔ برُش وہیں ملتا ہے، جھٹ اُسے اُٹھاتا ہوں لیکن اب کی بار اُسے اپنے رومال میں لپیٹ کر اوورکوٹ کی جیب میں ڈال لیتا ہوں کہ ریل گاڑی میں بیٹھ کر اطمنان سے پیک کر لوں گا۔

یہی کچھ پہلے بھی ہوتا آیا تھا اور یہی اُس موقع پر بھی ہوا۔ ظاہر ہے ٹوتھ برش کی تلاش میں میں نے بیگ میں موجود ہر فانی و غیر فانی چیز کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور ظاہر ہے کہ شومئی تقدیر سے اُسے وہاں نہیں پایا۔ میں نے تمام چیزوں کو دیکھا بھالا لیکن ٹوتھ برش تھا کہ آنکھ مچولی کھیلے جا رہا تھا۔ آخر تنگ آمد بجنگ آمد، میں نے تمام چیزوں کی جامہ تلاشی لینی شروع کر دی۔ قمیضوں اور پتلونوں کی جیبیں ٹٹولیں۔ کیتلیوں اور پیالیوں میں ہاتھ ڈالا۔ شیو کے سامان کو کریدا۔ کم بخت ملا بھی تو کہاں سے؟ میرے جوتے کے اندر سے، میں نے اُسے شیو کے سامان کے ساتھ رکھا اور پیکنگ کے مراحل سے از سرِ نو عہدہ برا ہونے لگا۔

جب تمام سامان بیگوں کے اندر رکھا جا چکا تو جارج نے پوچھا۔۔۔ ''کیوں جے؟ ٹوئیلٹ صابن رکھ لیا ہے ناں تم

نے؟؟''

''تمھارا کیا خیال ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''پتہ نہیں، میں نے دھیان نہیں دیا!!'' اُس نے کہا۔

خیمہ زنی کے لئے صابن کا ہونا ازحد ضروری تھا۔ پتہ نہیں میں نے صابن رکھا بھی تھا یا نہیں؟ میں نے جھنجھلا کر بیگ دوبارہ نیچے پٹخے اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں گھنٹوں محنت سے مرتب کردہ اشیاء اُتھل پتھل ہو کر عین اُس حالت میں واپس لوٹ گئی تھیں جب دنیا اپنے تخلیقی مراحل سے گزر رہی تھی اور تمام مظاہرِ قدرت بدنظمی کے عالم میں تھے۔ صابن تو خیر مل گئے، وہ تمباکو کے ڈبے پر قیلولہ فرما رہے تھے تاہم تمام پیکنگ کا جس طرح ستیاناس ہو گیا اُس کا مجھے بہت غصہ تھا۔ میں نے جھلاہٹ میں تمام چیزوں کو دوبارہ سمیٹنا شروع کر دیا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ سوا دس بج چکے تھے اور ابھی پیکنگ کے ضمن میں بہت سی فکیلیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہیرس نے مجھ سے کہا۔۔۔ ''دیکھو جے! ہمیں گیارہ بجے تک ہر حال میں بستر پر ہونا ہے تاکہ اگلی صبح اس قابل ہوں کہ سفر کر سکیں، بہتر یہی ہے کہ اب تم پیر پسار کر پڑے رہو اور آرام کرو۔ باقی کی پیکنگ جارج اور میں کر لیں گے!''

پیکنگ میری ہابی سہی لیکن آج جس طرح میری رضا کارانہ خدمات کا مذاق اُڑایا گیا تھا اُس نے میرے دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ میں جھٹ کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور بڑے آرام سے اُن دونوں کی چلت پھرت کے مزے لوٹنے لگا۔

وہ دونوں پورے اطمینان اور دلجمعی سے پیکنگ کر رہے تھے۔ دراصل وہ مجھے جتلانا چاہ رہے تھے کہ پیکنگ کیسے کی جاتی ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں میں تو محض طفلِ مکتب ہوں، بڑا بالائق پانہڈا، اُستاد ہیں تو بس وہی دونوں۔ میں نے زبان سے کچھ نہ کہا اور بڑے صبر اور سکون سے اُن کا تماشہ کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب جارج اور ہیرس کی جوڑی باہم مل کر پیکنگ قسم کا کوئی کارنامہ سرانجام دینے لگتی ہے تو کچھ نہ کچھ ہو کر رہتا ہے، کچھ مزیدار اور قابلِ دید نظارہ۔۔۔ میری نظروں کے سامنے ڈھیروں کی تعداد میں پلیٹیں، پیالے، کیتلیاں، بوتلیں، مرتبان، چولہے، ٹماٹر، کیک اور اسی قسم کا دوسرا علم غلم بے ترتیب دھرا ہوا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی کچھ نہ کچھ ضرور وقوع پذیر ہونے والا ہے۔

اور ایسا ہی ہوا۔ ایک دو بار نہیں بلکہ اس کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بارش کا پہلا قطرہ ایک کپ کے شہادت کے مرتبے پر فائز ہونے سے ہوا۔ یہ پہلا پتھر تھا جو انہوں نے پھینکا اور پھر مدّ و جذر بنتے چلے گئے۔

اس وقوعے کے بعد ہیرس نے سٹابری جام کو ٹماٹر کے اوپر رکھ کر پیک کر دیا، نہ صرف پیک کر دیا بلکہ پیک کرتے ہوئے ایسی توانائی کا مظاہرہ کیا کہ غریب ٹماٹر کا پلپلیتھن نکل گیا۔ نتیجتاً اُس کی وحشت زدہ لاش کو چمچوں کی مدد سے برآمد کیا گیا۔

اب جارج کی باری تھی۔ وہ مکھن پر چڑھ بیٹھا۔ میں نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اپنی کرسی کھسکا کر میز کے داہنی جانب لے گیا اور کہنی میز پر ٹکا کر ٹھوڑی کو دونوں ہتھیلیوں کی پیالی پر دھرا اور اُن کی حماقتوں کا نظارہ کرنے لگا۔ میری اس حرکت نے اُنہیں مزید بوکھلا دیا۔ وہ مختلف اشیاء پر راشن لے کر چڑھنے لگے۔ چیزیں اُن کی پشت پر موجود ہوتی تھیں اور وہ اُن کی تلاش میں وہاں موجود ہر شے کی یوں جامہ تلاشی لیتے تھے جیسے اُس شے کی گمشدگی اُنہی کی کارستانی ہو۔ کریم کے ساتھ بھی اُن کا سلوک لائقِ تذکرہ ہے۔ اُنہوں نے اُسے ایک بوتل میں ٹھونس دیا اور پھر اُس پر بھاری اشیاء لاد دیں، ظاہر ہے بیچاری کریم کا کیا بننا تھا، آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اُنہوں نے ہر شے کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا۔ میں نے ساری زندگی ایسا سلوک کسی کے ساتھ ہوتا نہیں دیکھا تھا جو انہوں نے ذرا سے مکھن کے ساتھ روا رکھا تھا۔ جب جارج اُسے اپنے سلیپر میں دریافت کر چکا تو پھر اُنہوں نے حفظِ مراتب کے طور پر اُسے ایک کتیلی میں رکھنے کی کوشش کی لیکن مکھن پوری طرح کتیلی کے اندر نہیں گھس پا رہا تھا چنانچہ انہوں نے اُسے دوبارہ باہر نکالنا چاہا تو جو شے کتیلی کے اندر رکھی گئی تھی وہ ثابت و سلامت برآمد نہ کی جا سکی۔ آخر انہوں نے اُس کا چورہ چورہ کیا اور یوں باہر نکالنے میں کامیاب ہوئے اور پھر اُسے کرسی پر رکھ دیا۔ ہیرس نے کیا کیا کہ

اُس پر چڑھ کر بیٹھ رہا اور پھر سارے کمرے میں اُس کی ڈھونڈ وریا پڑی۔

''میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اِسے یہاں رکھا تھا!'' جارج نے خالی کرسی کو گھورتے ہوئے کہا۔

''میں بھی اس بات کا گواہ ہوں کہ تم نے اُسے ابھی ایک منٹ پہلے یہیں پر رکھا تھا!'' ہیرس نے کہا۔

وہ دونوں سارے کمرے میں اُسے ڈھونڈتے پھرے اور پھر دونوں کا آمنا سامنا عین کمرے کے بیچوں بیچ ہوگیا۔

''اس سے زیادہ عجیب بات میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھی!!'' ہیرس بولا۔

''واقعی! بڑا پُر اسرار معاملہ ہے یہ!!'' جارج نے تائید کی۔

اور پھر دونوں از سرِ نو مکھن کی تلاش میں مشغول ہوگئے۔ اِسی اثنا میں جارج کی نظر ہیرس کی تشریف پر پڑی اور اُسے گمشدہ مکھن نظر آ گیا۔

''ارے! مکھن تو یہ رہا!!'' جارج کی آواز میں گرمجوشی کے ساتھ ساتھ غصہ بھی شامل تھا۔

''کدھر ہے؟'' ہیرس نے اُس کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

''سیدھے کھڑے رہو! سنا کہ نہیں!!'' جارج اُڑتا ہوا اُس کی طرف لپکا۔ مکھن دریافت کر لیا گیا۔ اب کی بار اُسے موزوں جگہ سے نوازا گیا۔

مونٹمورینسی بھی اس آنکھ مچولی کا ایک متحرک اور اہم کردار تھا۔ وہ بھی بس اپنی ہی طرح کی ایک مخلوق ہے۔ شائد اُس کی زندگی کا مقصد ہی یہی ہے کہ ہر اُس جگہ پر پنگا لے جہاں سے دیگر خلقِ خدا کی زندگی حرام ہونے کا امکان ہو۔ جس دن وہ یہ کام نہ کر سکا ہو تو جانو کہ وہ دن حرام گیا۔

خصوصاً اُس وقت تو وہ شیطانیت کا بینظیر پیکر لگتا ہے جب کسی سے اپنی ہی کسی غلطی پر کٹ کھا بیٹھے اور پھر اس سے بھرپور انتقام بھی لے مثلاً کسی بھی ایسی شے پر چڑھ بیٹھے جسے پیک کرنا مقصود ہو اور اس بات پر تو اُس کا روزِ آفرینش سے پختہ ایمان ہے کہ جب جارج اور ہیرس کسی سلسلے میں کسی نتیجہ پر پہنچنے والے ہوں تو یہ اُس کی ازلی ذمہ داری ہے کہ وہ اُس کام میں اپنی ٹانگ ضرور اڑائے۔ جام کی بوتل میں اپنی ٹانگ ڈال دے، چمچوں کی صفوں کو تہس نہس کر کے رکھ دے یا لیموؤں کو چوہے فرض کر لے اور اُن کا قلع قمع کرنا شروع کر دے تا آنکہ ہیرس فرائی پین کے

ہتھیار کا استعمال کر کے اُس کی فتوحات کا سلسلہ منقطع کر دے۔

ہیرس کا کہنا تھا کہ یہ سارا میرے لاڈ پیار کا نتیجہ ہے، میں ہی مونٹمورینسی کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں لیکن آپ خود ہی سوچیے، بھلا مونٹمورینسی جیسی مخلوق بھی کسی حوصلہ افزائی کی محتاج ہو سکتی ہے؟ دوسروں کی زندگی کو جہنم بنا دینے کا فرض اُس کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔

خدا خدا کر کے پیکنگ کا مرحلہ ۱۲:۳۰ کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ہیرس پلاسٹک کے ایک نازک سے مرتبان پر بیٹھتا ہوا بولا کہ امید ہے کہ مزید کسی شے کے ٹوٹنے کا امکان نہیں جبکہ ہیرس نے یہ کہہ کر سب کو تسلی دی کہ جس شے نے ٹوٹنا ہے وہ تو ٹوٹ کر

رہے گی، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

''میرا خیال ہے کہ اب سونے کا ارادہ کیا جائے!'' ہیرس نے کہا۔

ہم سب اُس سے متفق تھے۔ واقعی اب تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ہیرس نے رات ہمارے ہاں رُک جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم سب شب بسری کے لئے مکان کی اوپر والی منزل کو چل دیے۔

گھر میں صرف دو ہی پلنگ تھے چنانچہ اس بات پر ٹاس کیا گیا کہ ہیرس کس کے ساتھ سوئے۔ قرعۂ فال میرے نام نکلا۔

ہیرس نے پوچھا ''کیوں جے؟ تم کھڑکی کی طرف سونا پسند کرو گے یا دوسری طرف؟''

''میں پلنگ پر سونا پسند کروں گا!'' میں نے جواباً کہا۔

''پرانا لطیفہ ہے!'' ہیرس نے منہ بنا کر کہا۔

''میں صبح کب تک آپ حضرات کو جگا دوں؟'' جارج نے پوچھا۔

''سات بجے!'' ہیرس نے کہا۔

میں نے فوراً مداخلت کی۔۔۔ ''نہیں، چھ بجے، میں نے کچھ خطوط وغیرہ بھی لکھنے ہیں!!''

ہیرس اور میرے درمیان اس بات پر کچھ فقرے بازی ہوئی لیکن پھر ''نہ تیری نہ میری'' کے مصداق ساڑھے چھ پر معاملہ طے پا گیا۔

''ٹھیک ہے، ہمیں ساڑھے چھ بجے جگا دینا!'' ہم دونوں نے کہا۔

جارج نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم نے دیکھا کہ وہ اپنی ''خراٹا نشریات'' کا آغاز کر چکا ہے۔ شائد اُس نے ہماری بات سُنی ہی نہیں تھی۔

قطعات

دعویٰ

نکلے جو میکدے سے کہا شیخ جی نے یہ
گھس جائیں گے بہشت میں اے پھولؔ، بے خبر
کوئی ہمیں وہاں سے نکالے گا کس طرح
آدم ہمارے باپ تھے، وہ باپ کا ہے گھر

تنویرالدین احمد پھولؔ

شیطان جِن ہے

تذکرہ گستاخ ابلیس کا کرتے ہوئے
وہ فرشتہ اس کو سمجھے، ہائے یہ کیا کر دیا
بالیقیں شیطان جن ہے، رب نے قرآں میں کہا
حضرتِ غالب نے کیوں جن کو فرشتہ کر دیا

تنویرالدین احمد پھولؔ

بوفے سسٹم

قد تھا چھوٹا بہت، میز اونچی بہت
وہ اُچکتے رہے بندروں کی طرح
بوفے سسٹم میں کچھ ہاتھ آیا نہیں
منہ وہ تکتے رہے اُلوؤں کی طرح

تنویرالدین احمد پھولؔ

ملاوٹ

ملاوٹ ہے ہر اک شے میں، ہوا انساں بھی ناخالص
جو اشیاء کی ہے مہنگائی تو انساں کی ہے ارزانی
جو ہو جلوہ فگن یاں آفتابِ عدلِ فاروقی
نہ ہو مکھن میں چربی اور نہ خالص دودھ میں پانی

تنویرالدین احمد پھولؔ

انقلاب

یہ بولے شیخ جی محبوبہ سے بصد الفت
میں جس میں غرق ہوں وہ جھیل ہو گئی ہو تم
یہ انقلاب ہے کیسا؟ اب اُس سے کہتے ہیں
کہ بعد شادی کے اِک چیل ہو گئی ہو تم

تنویرالدین احمد پھولؔ

امریکن سسٹم

چاہت پیار خلوص کی رُت ماضی کا قصہ ہے
خود غرضی کا سارا سال اب موسم چلتا ہے
دعوت میری کر کے بولی نمبر اپنا دے دیں
یونیورسٹی میں امریکن سسٹم چلتا ہے

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

دل کا بائی پاس

ہو سکے تو یاد رکھنا مجھ کو اپنے دل میں تم
اس کے عاشق نے کہا تھا اُس کو کس اخلاص سے
بولی تیری یاد لے کر دل میں چل سکتی نہیں
میرا اپنا دل رواں ہے اب تو بائی پاس سے

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

تضاد

وہ دیکھنا بھی مجھ کو کرتی نہ تھی گوارا
کالج سے بھاگ کر میں جاتا تھا جس کے پیچھے
جاتے ہوئے وہ مجھ کو مڑ مڑ کے دیکھتی ہے
جب سے نئی پراڈو آئی ہے میرے نیچے

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

شکایت

بیوی اِک دن اپنے شوہر سے گلہ کرنے لگی
اُس کے دل میں چاہ اس کی اب وہ پہلی سی نہیں
بولا وہ شادی سے پہلے بھی تمہیں معلوم تھا
مجھ کو زوجاؤں سے بالکل کوئی دلچسپی نہیں

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

معجزہ

خیبر و پختون خواہ کے لوگ ہیں سب دور بین
دیکھتے ہیں سب سے پہلے چاند ہر تہوار کا
اِن کی پُھرتی دیکھ کر مجھ کو یقیں ہونے لگا
آنکھ کی تیزی بھی ہے اِک معجزہ نسوار کا

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

فی میل پاور

مجھے یہ زعم تھا مچھر سے مجھ کو کچھ نہیں ہوتا
بہت چوسا ہے میرا خون اکثر میل مچھر نے
مگر اس بار میری کپکپی دیکھی جو نرسوں نے
کہا "کاٹا ہے تم کو اس دفعہ فی میل مچھر نے"

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

واسا

ہر شخص کو خشکی ہے یا خارش کی وبا ہے
کھلتا نہیں سرکار کے پانی میں یہ کیا ہے
مجھ پر بھی جواں رُت میں عنایت ہے یہ اُس کی
سر پر جو مرے ”گنج“ ہے واسا کی عطا ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

خوشحالی

کون کہتا ہے کہ جو مفلس ہے وہ کنگال ہے
آج کے اِس دور میں امراء کا مندا حال ہے
اپنا رونا رو رہا ہے بات جس سے بھی کریں
اِک فقیروں کا ہے طبقہ جو یہاں خوشحال ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

نو ویکینسی

اِک روز اُس کو روک کے یہ التماس کی
اب مجھ کو فٹ کریں کہیں دل کے نصاب میں
کہنے لگی نہ کار نہ کوٹھی نہ افسری
تم تو کہیں بھی فٹ نہیں میرے حساب میں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

فیشن

مختصر کپڑوں کا اُس کو شوق ہے
وہ ہے مفلس بھول ہے یہ آپ کی
اس کو کپڑوں کی کمی کوئی نہیں
ٹیکسٹائل مِل ہے اُس کے باپ کی

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

مِس بٹ

دیکھنے میں وہ ہے اِک کالا گلاب
اس کی رنگت ہے سیاہ کیا شان کی
وہ مجھے کہتی ہے میں تو بٹ ہوں
میں اُسے کہتا ہوں ”ہاں سوڈان کی“

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

برائے شہرت

اندھے کو بھی فلم دکھائی جاسکتی ہے
بھینس کے آگے بین بجائی جاسکتی ہے
اخباروں میں غزلیں بھیجی جاسکتی ہیں
ایسے بھی تو شہرت پائی جاسکتی ہے

مسعود تنہا

سول انجینئر

یہ الگ میں فیس کا ہوں جونیئر
تم سے پھر بھی سینیئر ہوں جانِ من
تم سمجھتی ہو مجھے کیوں مستری؟
میں سول انجینئر ہوں جانِ من

ڈاکٹر عزیز فیصل

حلقۂ اربابِ دوزخ

سیکرٹ جس خبر کو رکھا گیا
اس کی شہرت چہار سو ہوئی ہے
حلقۂ ارباب ذوق دوزخ میں
نظم "جنت" پہ گفتگو ہوئی ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

آٹے کی قطار

میں نے جو کہا فون پہ کیسی ہو میری جان
کہنے لگی حالاتِ معیشت سے لڑی ہوں
فی الحال ترے پیار کی پروا نہیں مجھ کو
اِس وقت میں آٹے کی قطاروں میں کھڑی ہوں

خالد عرفان

ڈیڈ

جو انگریزی میں اب ڈیڈی کو اپنے ڈیڈ کہتے ہیں
بدل کر ڈیڈ کا مفہوم کہہ دیتے تو اچھا تھا
مرا مطلب یہ ہے اُردو میں اس کا ترجمہ کر کے
پدر کو والدِ مرحوم کہہ دیتے تو اچھا تھا

خالد عرفان

گرمی

نام پنکھے کے سکنے کا ہوا رکھا ہے
گرم موسم نے بہت ظلم روا رکھا ہے
اور اوپر سے ترے شعلۂ رخسار کی ہیئت
ایسا لگتا ہے کہ چولہے پہ توا رکھا ہے

خالد عرفان

قحط

ہر گلی میں رہنما اُگتے ہیں پیڑوں کی طرح
چاہے جتنی بھوک بڑھ جائے ہمارے ملک میں
کاش ایسا وقت بھی آئے کہ گندم کی جگہ
لیڈروں کا قحط پڑ جائے ہمارے ملک میں

خالد عرفان

Exploitation

مجھ سے چھوٹی تھی عمر میں دس سال
argue بھی نہ کر سکی مجھ سے
میں نے شفقت سے اُس کو چھیڑا تھا
احتراماً وہ پھنس گئی مجھ سے

خالد محمود

Sea View Venue

اُف سمندر میں سوئمنگ اُس کی
شرٹ بھی جسم سے چپکنے لگی
گرم سورج بھی ہو گیا یکدم
رال پانی کی بھی ٹپکنے لگی

عبدالحکیم ناصف

دعوتِ آم

سُنا ہے تجھ کو لنگڑا آم بھاتا ہے بہت جاناں!
میں اِس لنگڑے کی قسمت پر نہایت رشک کرتا ہوں
ذرا کھڑکی سے اس شوقین لنگڑے کی خبر بھی لے
ترے کوچے سے بیساکھی لئے میں بھی گزرتا ہوں

عبدالحکیم ناصف

ثنا

اک نوجواں نے پوچھا طریقہ نماز کا
امام کو کیا ہے یوں حیراں ابھی ابھی
پوچھا تھا یہ امام نے آتی ہے کیا ثنا
شرما کے بولے آتی ہے لیکن کبھی کبھی

غضنفر علی

Choice

اِک تھی حسین عورت شوہر تھے ان کے کالے
بولے کہ بچے میرے ہوں سارے پیارے پیارے
بھلا کے بولی عورت اِٹس چوائس آل یورس
ب سوچ کر بتا دو پیارے ہوں یا تمہارے

غضنفر علی

کل اور آج

کما کے میرے باپ نے دس سال میں مرے
چھوڑی ہے میرے واسطے کافی پروپرٹی
اس سے بھی زیادہ آج کماتا ہوں میں مگر
ہوتی نہیں ہے شام کی اس سے پروپر. ٹی

غضنفر علی

جادوگر ساس

ہوئی ہے جب سے شادی ہم بہت بیزار رہتے ہیں
لبوں سے اب ہمارے شکوے اور نالے نکلتے ہیں
وجہ یہ ہے کہ اب دروازے پہ ہے ساس کا سایہ
اور اس میں سے کبھی سالی کبھی سالے نکلتے ہیں

حمّاد حسن

رنگین مزاج

حسیناؤں کے کوچے میں اگر دو گز جگہ دیکھو
تو میری قبر یارو اُس جگہ فوراً بنا دینا
رقیبِ روسیاہ پہلے ہی نہ مرجائے اس ڈر سے
"reserve ہے یہ جگہ" کی اک یہاں تختی لگا دینا

حمّاد حسن

الحذر

وہ مجھ سے منگاتے ہیں بام اللہ اللہ
سمجھتے ہیں مجھ کو غلام اللہ اللہ
بلاتے ہیں وہ برف باری میں باہر
نہ ہو جائے مجھ کو زکام اللہ اللہ

حمّاد حسن

معجزہ

وطن کی پاک مٹی کو کیا اتنا خراب ہم نے
جہاں بوتے ہیں اب گاجر وہاں آلو نکلتے ہیں
ہماری رشوت خوری جھوٹ اور غیبت کی برکت سے
جنہیں ہم چنتے ہیں لیڈر وہی ڈاکو نکلتے ہیں

حمّاد حسن

امتحان

بیلن کو دیکھتے ہی غائب ہوئے ہم ایسے
پایا نہ کئی ہفتے نام و نشاں ہمارا
بیگم سے پٹنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا

احمد علوی

تنگ قافیہ

باپ معشوق کا خبر ہے گرم
آمدِ جنگ ہونے والا ہے
لوگ خوش ہیں کہ ایک شاعر کا
قافیہ تنگ ہونے والا ہے

احمد علوی

استقبالِ رمضان

بڑھاؤ قیمتیں گھی کی شکر کی اور آٹے کی
مبارک ماہ روزوں کا سنو آنے ہی والا ہے
ملے گی اُن کو عقبیٰ بھی، تمہیں یاں ہی ملے جنت
بنانے کا یہاں باغِ ارم نسخہ نرالا ہے

تنویرالدین احمد پھولؔ

مفت انجکشن

مفت انجکشن لگائیں چلتے پھرتے ڈاکٹر
اِن سے بچنے کے لئے اے دوستو! جائیں کہاں؟
پیٹ اپنا بھرتے ہیں پی کر لہو کا جام یہ
ہم جہاں پہنچے وہیں ہیں آ گئے مچھر میاں

تنویرالدین احمد پھولؔ

انمول موتی

کل مجھے اک میرے انکل نے کہا شادی سے قبل
زن مریدی کی ہر اِک ٹیکنیک پوری سیکھ لے
بات لاکھوں کی ہے لیکن مفت بتلاتا ہوں میں
جس نے خوش رہنا ہے گھر میں جی حضوری سیکھ لے

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

شوق

بابا بے شک بھولا بھالا سادا ہے
چاند سے مکھڑوں کا اب بھی دلدادا ہے
ٹخنے گھٹنے اس کے کم ہی چلتے ہیں
شادی کرنے پر اب بھی آمادہ ہے

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

تیز رفتاری

گھر سے پنڈی کو چلے تھے شادماں
بیٹھ کر ویگن میں یہ گزرا گماں
ہے ڈرائیور اس کا عزرائیل خود
دوسری دنیا کو ہے ویگن رواں

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

مجھے علم نہیں

گر رہا ہے علم کا معیار اب تو ہر جگہ
کہہ رہا تھا طفل اپنے باپ سے پاپا سنو
"مجھ کو کیا معلوم" کی جو مس سے انگلش پوچھ لی
مس بڑے آرام سے بولی کہ "آئی ڈونٹ نو"

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

روبینہ شاہین بیناؔ

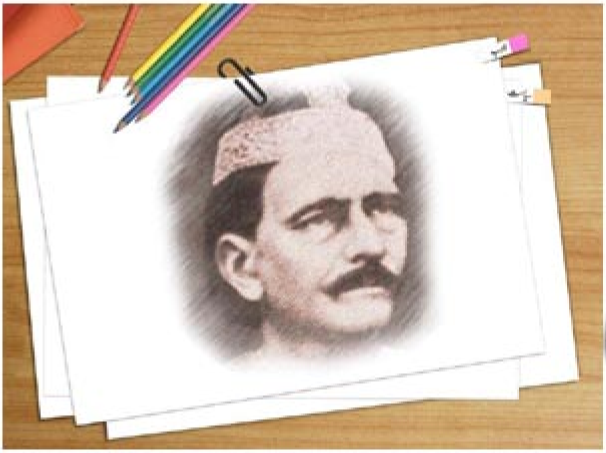

انشاءاللہ خان معرکہ آرائے سخن

غالباً میرے لڑکپن کا قصہ ہے کہ میری نظروں سے ایک شعر گزرا، جو کچھ یوں تھا:

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

مجھے اس شعر نے بہت متاثر کیا۔ لڑکپن کا زمانہ ہوتا ہی ایسا ہے جس میں کھیلنے کودنے سے متعلقہ سارے ''کام'' اچھے ہی لگتے ہیں۔ میں جب بھی اس شعر کو پڑھتی تھی تو یہی لگتا تھا جیسے یہ شعر یا تو خود عمرو عیار نے لکھا ہے یا پھر شاعر عمرو عیار کا جاننے والا ہے اور اپنے مشاہدات قلمبند کر رہا ہے۔ اُس زمانے میں، میں نے تازہ تازہ ''داستانِ امیر حمزہ'' پڑھی تھی چنانچہ اُس کے تمام کردار ہر وقت میرے ارد گرد گھومتے پھرتے تھے۔ مجھے اپنے ماموں امیر حمزہ نظر آتے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے ابھی ابھی کہیں سے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے پہنچے ہوں۔ اِسی طرح اس داستان کے دوسرے کردار بھی جا بجا چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مثلاً محلے کی مسجد کے مشکا مار کہ توند مولانا ''عادی کرب'' کی تصویر لگتے تھے۔ اسی طرح محلے کے ایک ہتھ چھوڑ ولن، جو چہرے سے ہی خوفناک دکھائی دیتے تھے، شداد جادوگر سے کم نہیں لگتے تھے۔ میں پوری ایمانداری سے اُنہیں ''شداد جادوگر'' ہی سمجھتی تھی۔ بلکہ ایک موقع پر تو اعلائے کلمۂ حق کی مرتکب بھی ہو گئی، نتیجتاً محلے میں بلوہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔

اُردو کے چند ایک تذکرہ نگاروں نے اُن کی ایسی تصویر کشی کی کہ گویا وہ کوئی ادبی پنگا باز قسم کی شے ہوں۔ کبھی وہ مصحفی کا جلوس نکالتے نظر آتے ہیں تو کبھی قلم کی تلوار سونتے عظیم بیگ، خالق، قتیل اور راغبؔ جیسے ادب کے ایکسٹرا اداکاروں سے نبرد آزما پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اُنہوں نے از راہِ اخلاص ان تمام حضرات کو پیشگی انتباہ کر دیا تھا کہ:

انشاءاللہ خان کو صاحب آپ نہ چھیڑیں مجلس میں
اِن باتوں میں بیٹھے بٹھائے لاکھ بکھیڑے پڑتے ہیں

لیکن یار لوگوں نے اُن کا کہنا نہ مانا اور یوں جو اُردو ادب میں بکھیڑے پڑنے تھے سو پڑے۔

انشاءاللہ خان انشاء کے تذکرہ نویس قدرت اللہ قاسمؔ، مصحفیؔ اور شیفتہؔ جیسے ادباء رہے ہیں جنہوں نے اُنہیں اُس نمبر کے چشمہ سے دیکھا جو اُن کے حریفوں نے فراہم کی تھی، یہی وجہ ہے کہ بعد ازاں اُن کی تصانیف کو خاصی شدت سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ عظیم بیگ کی گردن میں خاصا سریا تھا، یہی وجہ انشاءاللہ خان انشاء کے اُن سے متنفر ہونے کا باعث بنی۔ عظیم بیگ دلی کے ایک معمولی قسم کے متشاعر تھے لیکن خود کو اُردو کا صائب سمجھتے تھے، کسی دوسرے کو خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ ایک بار وہ انشاءاللہ خان انشاء کے والد، جو خود بھی ایک بہت اچھے شاعر تھے، کو اپنا کلام سنا رہے تھے۔ غزل بحرِ رجز میں تھی لیکن اس کے کئی اشعار بحرِ رمل کو اڑنگیاں دے رہے تھے۔ انشاءاللہ خان انشاء نے وہ غزل ازبر کر لی اور اُس کی تقطیع بھی کر ڈالی۔ جب عظیم بیگ نے وہی غزل نہایت کروفر سے مشاعرے میں پڑھی تو انشاء نے اُن سے تقطیع کرنے کو کہا، جواباً عظیم بیگ بغلیں جھانکنے لگے چنانچہ اہلِ ادب میں اُن کی خاصی سبکی ہوئی۔ انشاء نے پھر ایک مخمس سنائی جو اُن کی ہجو میں کہی گئی تھی۔ مولانا محمد حسین آزادؔ نے اُسے

آبِ حیات میں یوں رقم کیا ہے:

جو تو مشاعرے کو صبا آج کل چلے
کہیو عظیم سے کہ ذرا تو سنبھل چلے
اِتنا نہ اپنے شعر پہ کرتا وہ بل چلے
کل ہی تو یار پڑھتے غزل در غزل چلے
بحرِ رجز کو چھوڑ کے بحرِ رمل چلے

ہر چند تم تو فنِ سخن میں تھے بے نظیر
صائب ہو اپنے وقت کے تم شوکت و اسیر
سمجھو بقولِ سعدی نہ دشمن کو پُر حقیر
تھم کر پڑھو جو شعر تو ہو کون خردہ گیر
نہ یہ روانی جیسے کہ دریا اُبل چلے

شہر بھر میں آگ لگ گئی۔ عظیم بیگ بل کھا کر رہ گئے۔ ایک دوسرے مشاعرے میں انہوں نے جواباً ایک بارہ بند کا مخمس لکھ چھوڑا۔ اُنہوں نے انشاء کو مخاطب کر کے کہا:

وہ فاضلِ زمانہ ہو تم جامعِ علوم
تحصیلِ صرف ونحو سے جس کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاض و حکمت و ہیئت جفر نجوم
منطق بیانِ معانی کہیں سب زمیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اک دو غزل کے کہنے سے بن بیٹھے ایسے طاق
دیوان شاعروں کے نظر سے رہے بہ طاق
ناصر علی نظیری کی طاقت ہوئی ہے طاق
ہر چند ابھی نہ آئی ہے فہمید جفت و طاق
لنگوٹی تلے سے عرفی و قدسی نکل چلے

تھا زورِ فکر میں کہ کہوں معنی و مآل
تجنیس و ہم رعایتِ لفظی و ہم خیال
فرق رجز رمل نہ لیا میں نے گو سنبھال

لکھنؤ میں کوئی مرزا مومن بیگ تھے، جو علمِ قیافہ میں خاصی شد بد رکھتے تھے، انسان کے ظاہر و باطن کا نیک و بد معلوم کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ رنگین وسبحان قلی بیگ راغب امتحاناً اُن کے پاس پہنچے اور انشاء اللہ خان انشاء کی بابت اُن کی رائے پوچھی۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ انشاء کو گدھے کی خصلت سے بہت مناسبت ہے۔ راغب نے کہا کہ حضرات تعجب ہے کہ آپ ان کو خر ثابت کرتے ہیں وہ تو ایک زبردست شاعر، مردِ قابل اور خوش تقریر ہے۔ ہر علم میں اُسے دخل ہے کسی مجلس میں کوئی اُس کے آگے ٹھہر نہیں سکتا۔ انہوں نے جواب دیا کہ گدھے کی بھی یہی خاصیت ہے کہ جب وہ بولنا شروع کرتا ہے تو سب جانوروں کی آواز اُس کے آگے دب جاتی ہے۔ آزمائش کے طور پر انہوں نے کہا کہ تم خود جا کر انشاء سے پوچھ لو کہ اُسے کس جانور سے محبت ہے، وہ گدھے کا ہی نام لے گا۔ رنگین و راغب انشاء کے پاس پہنچے اور اُس سے یہی دریافت کیا۔ رنگین و راغب کو یہ دیکھ کر از حد تعجب ہوا جب انشاء نے یہی کہا کہ جہاں میں گدھے کا چھوٹا سا بچہ دیکھتا ہوں تو جی میں آتا ہے کہ اُسے گود میں اٹھا کر بے اختیار گلے لگا لوں کیونکہ:

جھوٹ سے چڑ ہے مجھے سچ یہ خدا بہتر ہے
آدمی ہو جو بُرا اُس سے گدھا بہتر ہے

نادانی کا مری نہ ہو دانا کو احتمال
گو تم بقدرِ فکر یہی کر حمل چلے

اِس واقعہ کے بعد قدرت اللہ قاسم نے بھی انشاء کی ہجو لکھی اور عظیم بیگ کو ہمیشہ کے لئے اپنا شاگرد اور انشاء کے ساتھ معرکہ آرائی میں اپنی سپر بنا لیا۔ یہ تھا وہ پہلا معرکہ جس نے انشاء کی آئندہ کی راہیں متعین کیں اور مزید معرکوں کے لئے توانائی فراہم کی۔

اِس اوّلین جھڑپ نے مزید پاؤں پھیلائے اور دلی کے مشاعرے شاعروں کا اکھاڑہ بن کر رہ گئے۔ دونوں جانب سے لوگ چوب و چماق سے مسلح ہو کر آنے لگے۔ اِسی زمانے میں انشاء نے ایک غزل تحریر کی جو فنی طور پر لاجواب اور تعلّی میں عدیم المثال

سمجھوں ہوں اسے مہرۂ بازیچۂ طفلاں
کس کام کا ہے گنبدِ گرداں میرے آگے
میں گوز سمجھتا ہوں سدا اُس کی صدا کو
گو بول اُٹھے ادھی کی چوں چوں میرے آگے
قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر
طفلی میں جو کل کرتے تھے غاں غوں میرے آگے

معین الملک مرزا میڈھو کے ہاں ایک مشاعرے میں انشاء نے ایک غزل ''پانچوں'' ردیف میں پڑھی جسے سُن کر محفل کشتِ زعفران بن گئی۔ انشاء کو اتنی داد ملی کہ ان کے حریف قاسم اور عظیم جل بھن کر کباب ہو گئے۔ اشعار کچھ یوں تھے:

چشم و ادا و غمزہ و شوخی و ناز پانچوں
دشمن ہیں میرے جی کے بندہ نواز پانچوں
کیا رنگ زرد و گریہ کیا ضعف و درد و فغاں
افشا کریں ہیں مل کر میرا یہ راز پانچوں
آرام و صبر و طاقت ہوش و حیا کہاں پھر
بے دل کے ساتھ یہ بھی اے عشوہ ساز پانچوں
مت پوچھ کارِ انشاء ہجر و وصال میں کچھ
صبر و جنون و وحشت عجز و نیاز پانچوں

قاسم نے دوسری محفلِ مشاعرہ میں ایک ایسی غزل تیار کی جس کی ردیف ''ساتوں'' تھی۔ قاسم کی یہ غزل شائد ضعیف ہو گی چونکہ انہوں نے اپنے تذکرے میں صرف یہی شعر لکھا ہے:

غم، رنج، درد، محنت، آفت، ستم، قیامت
فرقت میں تیری دیکھیں بندہ نواز ساتوں

اِدھر لوگوں نے انشاء کو اس کی خبر کر دی۔ انشاء نے فوراً مشاعرے کے لئے نئی غزل بنا لی جس کی ردیف ''آٹھوں'' تھی۔ انشاء نے یہ غزل سنا کر محفل لُوٹ لی اور قاسم کی محنت پر پانی پھر گیا۔

انشاء اور مصحفی سے منسوب ردیف ''انگلی'' کا بھی خاصا شہرہ ہے۔ سلمان شکوہ کے دربار میں ماہانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ مصحفی نے ایک بار، ایک نہایت جدید ردیف اور قدرے مشکل قافیہ پر مشتمل تھی:

اِک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہِ حکما سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں میرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں میرے آگے
ہے مرحلہ ضم غدیرِ آنکھوں میں چھپایا
کیوں چھپ نہ رہے خُم میں فلاطوں میرے آگے

مصحفی نے جواباً یہ اشعار کہے:

ہے جامِ طرب ساغرِ پُرخوں مرے آگے
ساقی تو نہ لانا مئے گلگوں مرے آگے

غزل لکھی۔ اُن کا خیال تھا کہ انشاء اسے چیلنج سمجھ کر ضرور اس میں انگلی ڈالیں گے۔ ہوا بھی یہی، اُن کی غزل کے چند اشعار کچھ یوں تھے:

زہرہ کی جب آئی کفِ ہاروت میں انگلی
کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں انگلی
مہندی کے یہ چھلے نہیں پوروں پہ بنائے
ہے اس کی ہر اک حلقۂ یاقوت میں انگلی
غرفے کا ترے حال پھر از بہر تاسف
ہر موج سے تھی کل دہنِ جوت میں انگلی
مغرب بجے جس وقت کہ تو چھیڑے ہے قانوں
ناچے ہے تری عالمِ لاہوت میں انگلی
تھا مصحفی پہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ
تھی اُس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

غزل کا پڑھنا تھا کہ ہر طرف سے داد و تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔ انشاء نے فوراً غزل کو اُلٹ کر یہ اشعار پڑھے:

زہرہ کی گئی کب کفِ ہاروت میں انگلی؟
کب رشک نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی؟
دیکھا ہے کبھی حلقۂ یاقوت جو تم نے
دی اس کی پھنسا حلقۂ یاقوت میں انگلی
پہنچائے ہے مخلوق کو خالق کی جگہ پر
مغرب کی نچا عالمِ لاہوت میں انگلی
ہیں آپ جولاہے کے خسر یا وہ تمہارا
الجھائے اسی واسطے ہیں سوت میں انگلی
تھا مصحفی کانا کہ چھپانے کو پسِ مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

علاوہ ازیں انشاء نے اِسی زمین پر ایک سنجیدہ غزل بھی لکھی جس کے چند اشعار یہ تھے:

دیکھ اس کی پڑی خانمِ یاقوت میں انگلی؟
ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی؟

غنچوں کو روند گل کو مسل اور صبا کو چھیڑ
لیکن نہ اُس کے عقدۂ بندِ قبا کو چھیڑ

انشاء اللہ خان انشاء

پلٹے ہے مری آہ فلک میں تو کہوں میں
یوں ڈالتے ہیں تیغِ مسکوت میں انگلی
ناسوت کے عالم میں پئے سیر ہم انشاء
کرتے ہیں شگافِ درِ لاہوت میں انگلی

انشاء کی شوخی، شرارت اور جارحانہ انداز پر چیں بہ جبیں ہو کر مصحفی نے اس کا جواب ان اشعار میں دیا:

بے معنی ہے خونِ سرِ جالوت میں انگلی
جیسے دہنِ عابدِ طالوت میں انگلی

ایک دن سید انشاء اللہ خان انشاء نواب صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ گرمی کی وجہ سے دستار سر سے اتار کر رکھ لی۔ انشاء کا منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب صاحب کو شرارت سوجھی اور ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ٹھونگ ماری۔ جس پر انشاء نے جلدی سے دستار سر پر رکھ لی اور کہنے لگے کہ سبحان اللہ! بچپن میں بزرگوں سے سنا کرتے تھے کہ جو لوگ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں شیطان ان کے ٹھونگیں مارتا ہے۔ آج معلوم ہوا کہ وہ بات سچی تھی۔

کچھ مصرعہ اول سے نہیں ربط بھی اِن کو
حاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی
جورو تیری چھیلا ہو تو کیوں کر نہ کروں غش
دیکھ اس کی پڑی خاتمِ یاقوت میں انگلی

مصحفی کے شاگردوں نے اس انداز سے مغلظات کا بازار گرم کردیا کہ توبہ بھلی۔ یہ سلسلہ کافی دور تک گیا۔

اِسی اثناء میں مصحفی نے اپنی استادی کی دھاک جمانے کے لئے شہزادہ سلیمان کے دربار میں ایک نہایت ثقیل قوافی اور مشکل ردیف میں آٹھ اشعار کی غزل کہی جس کے چند اشعار یوں تھے:

سر مُشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موئے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن
مچھلی نہیں ساعد میں ترے بلکہ نہاں ہے
وہ ہاتھ میں ہی ماہی سقنقور کی گردن
دل کیوں کہ پری حور کا پھر اس پہ نہ پھسلے
صانع نے بنائی تری بلور کی گردن
کیا جانیے کیا حال ہوا صبح کو اس کا
ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن
یوں زلف کت حلقے میں پھنسا مصحفی اے وائے
جوں طوق میں ہووے کسی مجبور کی گردن

انشاء نے اس غزل پر اعتراض کرتے ہوئے یہ قطعہ لکھا:

سُن لیجے گوشِ دل سے مرے مشفقا یہ عرض
مانندِ بید غصے سے مت تھر تھرایئے
بلور گو درست ہو لیکن ضرور کیا
خواہی نخواہی اس کو غزل میں کھپایئے
کیا لطف ہے کہ گردنِ کافور باندھ کر
مردے کی باس زندوں کو لا کر سنگھایئے
گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا
سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلایئے
دستور و طور و نور یہ ہیں قافئے بہت
اِس میں جو چاہیے تو قصیدہ سنایئے
ایسے نجس کثیف قوانی سے نظم میں
دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمایئے
استاد گرچہ ٹھہرے ہیں صاحب یونہی سہی
لیکن ڈھکی ہی رکھئے اس کو چھپایئے

علاوہ ازیں انشاء نے اسی ردیف اور قوافی میں ایک غزل بھی کہی:

توڑوں گا خمِ بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اِک حور کی گردن

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

انشاء اللہ خان انشاء

کیوں ساقیِ خورشید جبیں، کیا ہی نشہ ہے
سب یونہی چڑھا جاؤں مئے نور کی گردن

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا، منہ خوک کا، لنگور کی گردن

اچھلی ہوئی ورزش پہ تری ڈنڈ پہ مچھلی
ہے نامِ خدا جیسے سقنقور کی گردن

اے دیوِ سفیدیٔ سحر کاش تو توڑے
اک مکّے سے خود کے شبِ دیجور کی گردن

محفل میں تری شمع بنی موم کی مریم
پگھلی پڑی ہے اس کی وہ کافور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشاء
تو توڑ دے جھٹ بلعمِ باعور کی گردن

انشاء کے اعتراض پر مصحفی کا جوابی قطعہ بھی ملاحظہ کرنے کی شے ہے:

اے آنکہ معارض ہے مری تیغِ زباں سے
تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن

ہے آدمِ خاکی کا بنا خاک کا پتلا
گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن

میں لفظ سقنقور مجرد نہیں دیکھا
ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن

گردن تو صراحی کے لئے وضع ہے ناداں
بیجا ہے غمِ بادۂ لنگور کی گردن

لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں
کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن

کافور سے مطلب ہے مرا اس سے سفیدی
ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن

کافور تو میت کا اسے سمجھے بہ ایں عقل
اور آپ جو پھر باندھے تو کافور کی گردن

مضمون وہ میرا ہی ہے گو اور طرح سے
باندھے ہے گماں اپنے میں رنجور کی گردن

جو گردنیں باندھی ہیں میں لا تجھ کو دکھا دوں
تو مجھ کو دکھا دے شبِ دیجور کی گردن

ٹوٹے ہوئے پنجے کی طرح میرے قلم سے
جاتی ہے پچک شاعرِ مغرور کی گردن

اساتذہ کی دیکھا دیکھی دونوں شعراء کے شاگرد بھی میدان میں آن اترے اور وہ دھمال مچائی کہ الاماں والحفیظ۔ مصحفی کے ایک شاگرد حیدر علی گرم نے اسی زمین پر ایک غزل کہی جس کا ایک شعر یہ تھا:

سر کاٹ کے اُس کا ابھی گنگا میں بہا دوں
لگ جائے مرے ہاتھ جو لنگور کی گردن

ظاہر ہے کہ لنگور سے مراد محترم انشاء تھے۔ غرض دونوں جانب سے گھمسان کی جنگ رہی۔ مسئلہ محض مشاعروں تک محدود رہتا تو کوئی بات بھی تھی لیکن سوانگ کے جلوسوں نے باہمی ماحول کو خاصا کشیدہ کر دیا۔ دونوں اطراف سے سوانگ کے جلوس

نکالے گئے جس میں شریک افراد مخالفین کی ہجوئیں پڑھتے ہوئے اُس کے گھر تک جاتے۔ پہلے مصحفی نے سوانگ کا جلوس نکالا اور پھر انشاء نے۔ بہرحال انشاء اور مصحفی میں یہ تلخی تاعمر برقرار رہی، اگرچہ انشاء نے مصحفی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے:

میر و قتیل و مصحفی و جرأت و رنگیں
ہیں شاعروں میں یہ جو نمودار چار پانچ

مندرجہ بالا واقعات سے تو لگتا ہے کہ انشاء نے محض دشمنیاں ہی پالی ہیں لیکن ایسا نہیں تھا۔ ریختی کے سُرخیل سعادت یار خان رنگین سے انشاء کا تاحیات یارانہ رہا۔ دونوں میں کس قدر گہرے روابط تھے، اس کا اندازہ رنگین کی تحاریر سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

"میرے اور انشاء اللہ خان انشاء کے درمیان اس قدر دوستی اور اخلاص ہے کہ تحریر میں نہیں آسکتا۔"

انشاء کے ہاں اس امر کا اعتراف اس شعر سے جھلکتا ہے:

عجب رنگینیاں ہوتی تھیں تب باتوں میں اے انشاء
ہم مل بیٹھتے تھے جب سعادت یار خاں اور ہم

گر نازنیں کہے سے بُرا مانتی ہیں آپ
میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی
انشاء اللہ خان انشاء

بدیہہ گوئی میں انشاء اور رنگین دونوں ہی استاد تھے۔ ایک مرتبہ شہزادہ سلیمان شکوہ ہاتھی پر سوار ہو کر فتح علی خان کے دربار کے لئے گئے۔ باغ پر بہاروں کی جولانی چھائی ہوئی تھی۔ انشاء اور رنگین بھی شہزادے کے ہمراہ تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ نے مطلع کہا:

نہ تو سیرِ گُل کا دماغ ہے، نہ جہاں سے رنگِ فراغ ہے
یہ جو اپنے سینے کا داغ ہے، یہی گل ہے اور یہی باغ ہے

انشاء نے تبدیلی قافیہ کے ساتھ فوراً مطلع پیش کیا:

نظر اپنی اُس سے جو لڑ گئی تو وہ چتون آنکھوں میں گڑ گئی
مژہ دل میں ایسی ہی گڑ گئی کہ جو بات تھی سو ٹھہر گئی

رنگین نے اس بحر میں یہ دو شعر موزوں کئے:

یہ دل اپنا جس کا غلام ہے اجی قاتل اس کا ہی نام ہے
اسے ہم سے چھیڑ مدام ہے، ہمیں کام اپنے سے کام ہے
مرا دم تو آیا ہے ناک میں، نہیں باقی ذرہ ہلاک میں
مجھے یوں ملا دیا خاک میں ارے عشق تجھ کو سلام ہے

انشاء اور رنگین کی بے تکلف دوستی میں انشاء کی شوخی و ظرافت کے امتزاج نے خوب خوب گلکاریاں کیں۔ ایک مرتبہ انشاء، رنگین سے ملنے اُن کے مکان پر گئے۔ جب یہ اندر پہنچے تو دیکھا پسِ چلمن لاڈو بیگم کوئی خاتون بیٹھی ہیں۔ انشاء نے از راہِ شوخی رنگین کی طرف دیکھتے ہوئے کنایتاً یہ شعر پڑھا:

کیا فائدہ خالی جو ملاقات کی ٹھہرے
تب خوش ہو مرا دل کہ جب اِس بات کی ٹھہرے

انشاء اللہ خان انشاء نواب سعادت یار خان کے دربار سے وابستہ تھے۔ کہتے ہیں "تیراک کی موت پانی میں ہوتی ہے"۔ انشاء کو بھی اُن کی مصاحبت اور بذلہ سنجی لے ڈوبی اور وہ کہاوت سچ ہوگئی کہ حاکم کی اگاڑی اور پچھاڑی دونوں خطرناک ہوتی ہیں۔ جب نہال ہوئے تو موتی لٹا دیے۔ خزانے بخش دیے اور ناراض ہوئے تو پھانسی پہ لٹکوا دیا۔ انشاء کے ساتھ یہی کچھ ہوا۔ ایک دن حسبِ معمول دربار میں محفل سجی تھی۔ انشاء بلبل کی طرح چہک رہے تھے اور نواب کے ساتھ ساتھ اہلِ دربار بھی خوب لُطف اندوز ہو رہے تھے، بعض خاندانی شرفاء کی شرافت و نجابت کے تذکرے

ہو رہے تھے۔ سعادت علی خاں نے کہا'' کیوں بھئی! ہم بھی نجیب الطرفین ہیں؟'' اَب اِسے تقدیر کہا جائے یا زود گوئی کا نتیجہ، انشاء بول اٹھے۔ ''حضور نجیب الطرفین نہیں بلکہ انجب۔۔۔'' بس غضب ہوگیا۔ کیوں کہ سعادت علی خاں ایک لونڈی کے بطن سے تھے اور انجب کے دو معنی ہوتے ہیں۔ ایک لونڈی زادے کے اور دوسرے جو ماں باپ اور خاندان، ہر طرف سے اعلیٰ نسب ہو۔ سعادت علی خاں لونڈی کے بطن سے تھے اس لیے انھوں نے سمجھا کہ انشاء نے اُن پر چوٹ کی ہے۔ جب کہ اُن کا یہ مطلب نہ تھا۔ لیکن اُسی دن سے سعادت علی خاں نے دل میں کینہ پال لیا اور موقع تلاش کرنے لگے کہ کسی طرح انشاء کو زچ کیا جائے۔ اَب نواب کے انداز بدلنے لگے۔ انشاء نے بہت چاہا کہ اُن کے دل سے یہ کانٹا نکل جائے۔ لیکن کام یاب نہ ہوسکے۔ اِسی پر بس نہیں۔ ایک دن اور انشاء نے اپنی اِسی زود گوئی کے سبب اپنی بربادی کا سامان کرلیا۔ ہوا یوں کہ انشاء نے نواب کو پھڑکتا ہوا لطیفہ سنا دیا۔ نواب نے کہا'' انشاء جب کہتا ہے ایسی ہی بات کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی۔'' انشاء جذبات میں آ کر بولے۔ ''حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسے ہی کہے جاؤں گا

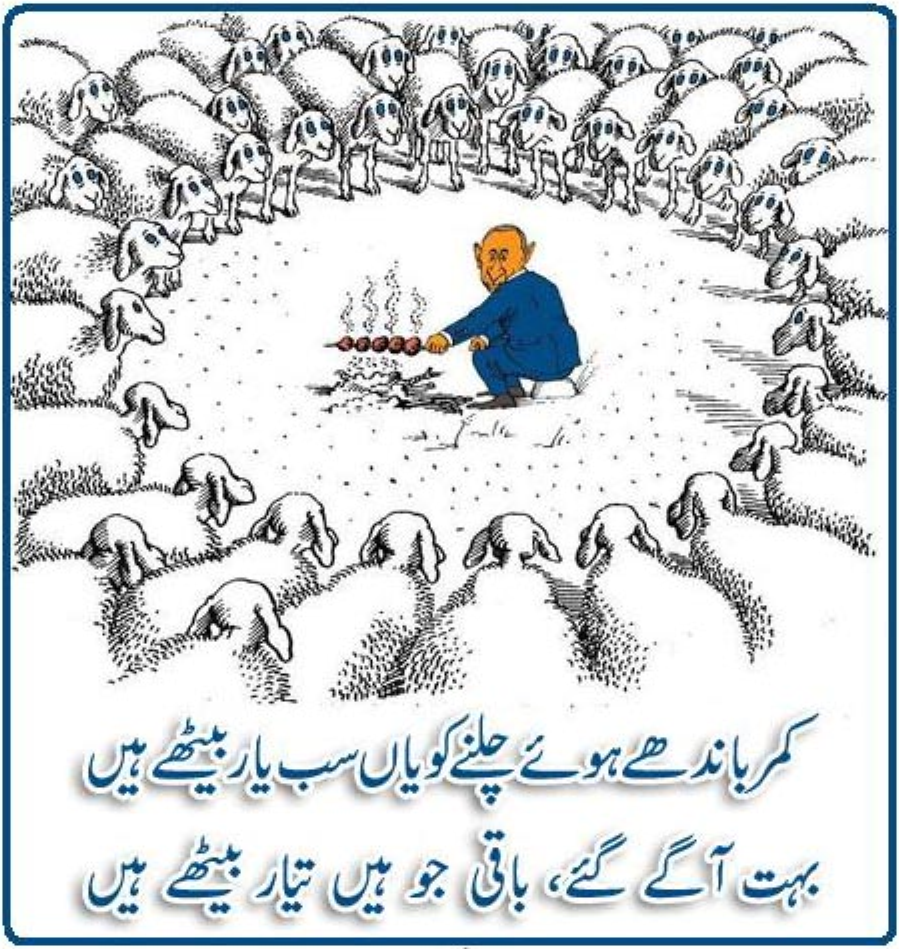

کہ نہ دیکھی ہو نہ سنی ہو۔'' نواب تو تاک میں تھے، فوراً بولے'' بس زیادہ نہیں دو لطیفے روز سنا دیا کیجیے۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ دیکھے ہوں نہ سنے ہوں۔ نہیں تو خیر نہ ہوگی۔'' انشاء سمجھ گئے کہ یہ انداز اور ہیں۔ گلیوں بازاروں میں پھرتے تھے اور ایک ایک سے کہتے تھے کہ کوئی نیا لطیفہ سنا دو۔ پھر ''مرے پہ سو دُرّے'' یہ ہوا کہ نواب نے ایک دن انہیں بلوایا۔ مگر یہ کہیں اور گئے ہوئے تھے۔ نواب کو جب پتا چلا کہ وہ کسی اور امیر کے ہاں گئے تھے تو فوراً بلوایا اور حکم دیا کہ ہمارے علاوہ کسی اور کے ہاں مت جایا کرو۔ گھر سے نکلنے پر پابندی لگ گئی۔ اِسی دوران اُن کا جوان بیٹا مر گیا۔ اِس صدمے سے حواس مختل ہوگئے۔ پھر نواب نے اُن کی تنخواہ بھی بند کردی۔

انشاء کے جگری یار رنگین لکھنؤ کی کسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ معلوم ہوا قریب ہی کہیں مشاعرے کا اہتمام ہے۔ یہ

بھی شریک ہو گئے۔ اچانک ایک شخص میلی کچیلی روئی کی مرزئی پہنے آیا، سلام کر کے بیٹھ گیا، پوچھا کہ مشاعرہ کیوں شروع نہیں ہوا۔ کسی نے جواب دیا ابھی اور لوگ جمع ہو جائیں تو شروع ہوگا۔ وہ بولے ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں یہ کہہ کر غزل نکالی اور کاغذ پر دیکھ کر پڑھنی شروع کر دی۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں
بسانِ نقش پائے رہ رواں، کوئے تمنا میں
نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل آہ، ننگ و نام کیا شئے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو، یہی کہتے ہیں ہم بے کار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

یہ مشہور غزل پڑھ کر کاغذ پھینک کر سلام کر کے چلے گئے، مگر زمین و آسماں میں سناٹا چھا گیا۔ مقطع سے پتا چلا کہ یہ سید انشاؔ تھے۔ رنگین نے بھی غزل سُن کر انھیں پہچانا۔ حال معلوم کیا تو بہت دُکھی ہوئے۔ پھر آخری بار جب اُن کے گھر گئے تو دیکھا، جس دروازے پر ہاتھی جھولتے تھے، وہاں خاک اُڑ رہی ہے اور کتے لوٹ رہے ہیں۔ رنگین اندر گئے تو اُن کی بیوی نے بتایا "کہ اُن کی عجب حالت ہے۔" دیکھا تو ایک کونے میں بیٹھے ہیں، سر زانو پر رکھا ہے۔ آگے راکھ کا ڈھیر تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا حقہ پاس رکھا تھا۔ کہاں وہ شان و شوکت، کہاں یہ حالت جو دیکھی نہ جاتی تھی۔ رنگین دیر تک دوست کی حالت دیکھ کر روتے رہے اور پوچھا "انشاء! کیا حال ہے؟" انھوں نے سر زانو پر رکھ لیا اور پھر نہ اُٹھایا۔

اِتنا قادر الکلام شاعر جس نے ہر صنفِ سخن کو آزمایا، اَن گنت شعر کہے، ایسے وقت میں جب وہ اپنے مطالعے اور مشاہدے کو اپنی زندگی کے تجربات سے ہم آمیز کر کے اِظہار کی اعلیٰ ترین شکل میں ڈھال کر اپنے پڑھنے والوں کے سپرد کر سکتا تھا یوں خاموش ہوا کہ حسرت و یاس کی تصویر بن گیا۔

اُن کے کلام کی کچھ پھلجھڑیاں:

بوسیدہ لغت چھانٹی ہے اللہ کرے پڑ جائے
اے شیخ! تری عقل کی فرہنگ میں کیڑا

چھیڑنے کا تو مزا تب ہے کہو اور سنو
بات پر تم تو خفا ہو گئے لو اور سنو

مزے خوب لوٹو گے کیوں شیخ صاحب
ملیں گے بہشتِ بریں میں اگر پر
زمرد کی اِک چونچ ہو گی بڑی سی
کہ مارو گے ٹھونگ اُس سے ہر اک کمر پر
پڑے روز پھریئے گا جوں کالا کوا
کبھی اِس شجر پر کبھی اُس شجر پر

اور بھی پرواز اگر منظور ہو تو زاہدا
گانٹھ لیجے دم میں اپنے پر کوئی سرخاب کا

بیٹھا ہے جب تندریلا شیخ آ کے بزم میں
اک بڑا مٹکا سا رہتا ہے شکم آگے دھرا

بیٹھا ہے آج مجلسِ رنداں میں شیخ یوں
طوطی کے ساتھ جیسے کوئی ہم قفس ہو زاغ

شیخی اتنی نہ کرائے شیخ کہ رندانِ جہاں
انگلیوں پر تجھے چاہیں تو نچا سکتے ہیں

وہ کر پنجہ انشاء سے بولے کہ واہ
اسی زورِ بازو پہ اتنا گھمنڈ

اے دل سمجھ کر اُس کی تو زلفِ رسا کو چھیڑ
کم بخت کیا کرے ہے نہ کالی بلا کو چھیڑ

چھیڑ کی بات سوا اور نہیں
یعنی لڑنے ہی پہ تیار ہو تم
سچ نہ بولے کبھو انشاء سے چلو
اجی سب جھوٹوں کی سردار ہو تم

میرے منہ سے جو کبھی نام سنا انشاؔ کا
تو نے وہ دھوم مچائی کہ الٰہی توبہ

ہے جو کوٹھے تلے کھڑا اُس کو
ٹھنڈے ٹھنڈے کہو کہ گھر جائے

میں کیسی نباہتا ہوں تجھ سے
انشاء اللہ دیکھیے گا

تری آشنائی میں کیا ہم نے پایا
دیا نقدِ دل اور اپنی گرہ کا

تم نے تو نہیں، خیر یہ فرمایئے بارے
پھر کن نے لیا راحت و آرام ہمارا

یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عید قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے!
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب الٹا

سحر ایک ماش پھینکا مجھے جو دکھا کے اُس نے
تو اشارا میں نے تاڑا کہ ہے لفظِ شام الٹا

فقط اس لفافے پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اُس نے انشاءؔ یہ ترا ہی نام الٹا

دو باتیں فارسی کی سیکھ اس نے میر انشاءؔ
بس لکھنؤ سے سارے کابل کا منہ چڑایا

لیلیٰ نے آکے نجد میں مجنوں سے یوں کہا
کیا آپ نے پسند کیا ہے اجاڑ خوب

راتوں کو نہ نکلا کرو دروازہ سے باہر
شوخی میں دھرو پاؤں نہ اندازہ سے باہر

تک شیخِ سیہ رو کے تبسم کو تو دیکھو
معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہنستا ہے توا گرم

کاٹے ہیں ہم نے یونہی ایام زندگی کے
سیدھے سے سیدھے سادے اور کج سے کج رہے ہیں

آج کچھ کام میں ہوں پوچھے جو کوئی مجھ کو
تو یہ باہر ہی سے کہہ دیجو کہ وہ گھر میں نہیں

نہ کوٹھے پہ آئے کبوتر اُڑانے
گئی ٹوٹ کل بیگما کی توقع

ای کتاب

ارمغانِ ابتسام کے لئے بطورِ خاص لکھی گئی

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

جیسے بغیر چابی کے تالہ نہ کھل سکے
بجلی بغیر یہ ''ای رسالہ'' نہ کھل سکے
جھنجھٹ نہ پبلشر کا، پریس کا نہ اِنک کا
کرتے ہیں انتظار فقط اس کے لنک کا
اینڈرائڈ آئی پیڈ پہ ہے لیپ ٹاپ پر
لیکن نہ مل سکے گا کسی کو یہ شاپ پر
بُک شیلف اس کو ڈھونڈ رہا ہے کدھر گیا
نیٹ پر رسالہ نیل سے تا کاشغر گیا
بازار میں ملے نہ بُک سٹال میں
ملتا ہے نیٹ پر یہ فقط ویب کے جال میں
کہتا ہے اس کو کون ادھوری کتاب ہے
کاغذ نہیں ہے پھر بھی یہ پوری کتاب ہے
کوئی پٹخ سکے گا نہ غصے میں ای کتاب
کوئی نہ کہہ سکے گا چھٹی ہے تو سی کتاب
پُڑیاں بنائے گا نہ کوئی ای کتاب کی
زینت نہ بن سکے گی یہ چپلی کباب کی

کوئی نہ اِس کتاب کو ایسے ستائے گا
اس پر حساب دھوبی کا لکھا نہ جائے گا
رکھے گی اب نہ دوستی جاہل سے یہ کبھی
گھائل نہ ہو گی خنجرِ پنسل سے یہ کبھی
آزاد ہے یہ ہر طرح ابھری ہے یہ امیج
پر اس کے باندھ سکتی نہیں کاغذوں کی کیج
محفوظ ہے لکیروں سے بچوں کی یہ کتاب
صفحات پر نہ اس کے گرے گا کبھی خصاب
کاغذ ہی جب نہیں ہے تو پھاڑے گا اِس کو کون
جب جلد ہی نہیں ہے تو جھاڑے گا اس کو کون
کہتا ہے اب جو پڑھنے کو دیجے ہمیں کتاب
ہم اس کو بھیج دیتے ہیں بس لنک اِک شتاب
ملتا رہے گا ویب پہ جو چاہیں حوالے کو
چوہے کُتر سکیں گے نہ اس ای رسالے کو
ای پبلشنگ میں اس کی ہے سارا ظفر کا ہاتھ
اس پر لگا نہیں ہے کسی پبلشر کا ہاتھ
مظہر جدید دور کا تحفہ نرالا ہے
ای میل سے ملا یہ ہمیں ای رسالہ ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

اسلام آباد میں الرجی

سلگا رہے ہیں نخلِ بہاراں مشامِ جاں
جھونکے ہوا کے لائے ہیں امراض سانس کے

کیسا ستم ہے شہرِ گل و یاسمن کے لوگ
جشنِ بہار آج مناتے ہیں کھانس کے

قسمت کی بدنصیبی نہیں ہے تو کیا ہے یہ
آئی بہار اور گئے دن "رومانس" کے

پہلو میں دل کو بھی نہیں ملتا کوئی قرار
اعضائے جسم تھک گئے ہیں اب تو "ڈانس" کے

ناپائیداری سانس کی دیکھی ہے جب سے یوں
دن زندگی کے اب تو یہ لگتے ہیں "چانس" کے

ملتے نہیں مزاج تو حیرت ہو کیوں بھلا
انسان پوٹھوہار کے پودے فرانس کے

خالد محمود

گنجا

سر اپنا جو نزدیک سے دِکھلاتا ہے گنجا
دل زوجہ کا اِس طرح بھی متلاتا ہے گنجا

اِک بار تو ہر چیز کی رُک جاتی ہیں سانسیں
کنگھا جو کبھی ہاتھ میں لہراتا ہے گنجا

ڈیشنگ ہو کوئی ہم سا تو پھر سامنے آئے
آئینے میں خود سے یہی فرماتا ہے گنجا

جیسے کسی تربوز کو ٹانگیں سی لگی ہوں
یوں دور سے دیکھیں تو نظر آتا ہے گنجا

ٹوپی جو اُتارے تو نکل آتا ہے ہیلمٹ
حیران و پریشان کئے جاتا ہے گنجا

بینگن کبھی لگتا ہے تو ٹینڈا کسی لمحے
ہر روپ میں ڈیسینٹ نظر آتا ہے گنجا

اُس پار کی لٹ کھینچ کے لاتا ہے جو اِس پار
صحرا پہ کوئی پُل سا بنا جاتا ہے گنجا

جوؤں کے تو جل جاتے ہیں فوراً! وہیں پاؤں
جب ٹنڈ کو لئے دھوپ میں آ جاتا ہے گنجا

دھوتا ہی چلا جاتا ہے دھونے جو لگے منہ
ماتھے سے کمر تک بھی پہنچ جاتا ہے گنجا

جاتے ہوئے آتا ہوا دیتا ہے دکھائی
ہر سمت سے اِک جیسا نظر آتا ہے گنجا

سر تیل سے چمکاتا ہے جب مار کے ٹاکی
ایسے میں تو سورج کو بھی چندھیاتا ہے گنجا

اولے تو بڑی بات ہے، بارش بھی پڑے تو
سر دیر تلک بچوں سے دبواتا ہے گنجا

اِک بار تو ہو جاتا ہے نائی بھی پریشاں
جھالر اسے گردن کی جو پکڑاتا ہے گنجا

خالد عرفان

ٹیکسٹ میسج

تہذیب میری ٹیکسٹ کے میسج میں کھو گئی
یہ بات سوچ سوچ کے سِک ہو رہا ہوں میں

پہلے خطوط بھیج کے جو پوچھتی تھی حال
اُس کی فرینڈ لسٹ میں ٹِک ہو رہا ہوں میں

قسمت سے میرا نام بھی نکلا کبھی کبھی
قرعہ ہوں، اُس کے ہاتھ سے پِک ہو رہا ہوں میں

پہلے ہنی تھا، جان تھا ، دلبر تھا، چاند تھا
اور آج تین چار سے اِک ہو رہا ہوں میں

جس نے کیا تھا کیچ مرے عشق کا پیام
اُس بے وفا کے پاؤں کی کِک ہو رہا ہوں میں

پہلے تو ''عید کارڈ'' مجھے بھیجتی تھی وہ
اب صرف نام لکھ کے کلِک ہو رہا ہوں میں

ڈاکٹر عزیز فیصل

مجھے یقین ہے
کہ تم کون مہندی سے
جب میرے عدو کا نام
اپنی خوبصورت کلائی پر لکھو گی
تو
میرا خیال آتے ہی
آخر ایک دن
اس منحوس کے نام پر
خود ہی
بڑا سا کانٹا لگا دو گی
اور دوسری کلائی پر
میرا نام لکھ کر
اسے دیر تک چومتی رہو گی
میں اس لمحے کے انتظار میں
متبادل کلائیوں کی جانب سے موصولہ

ہزاروں دل پذیر آفریں
مسلسل مسترد کیے جا رہا ہوں
کیونکہ
دنیا امید پر قائم ہے

منزہ سید

فیس بُک کا نقاد

مرا انداز ہے کچھ شاعرانہ
تبھی ہے فیس بک میرا ٹھکانہ
کیا ہے جب سے ''ایویں پاس'' میں نے
نظر آتا ہے ان پڑھ یہ زمانہ
ہمیشہ ''آم'' کو کہتی ہوں ''مینگو''
کبھی کہتی ہوں کیلے کو ''بنانا''
تڑپنے کو میں کہتی ہوں ''تڑفنا''
میں بیگانے کو پڑھتی ہوں ''بگانہ''
مری پوشاک ہے لاچہ و کرتہ
مگر سینڈل پہنتیاہوں زنانہ
ذرا سا ڈائٹنگ پہ آج کل ہوں
تبھی کھاتا ہوں نو دس بار کھانا
سبھی مردوں کی عمدہ شاعری پر
مری تنقید ہو گی ''تازیانہ''
مرے بھائیو! تمھارے واسطے بس
مرا ''کومنٹ'' ہو گا ''ناصحانہ''

نیا شاعر جو بہتر مجھ سے لکھے
مجھے اُٹھتا ہے دردِ حاسدانہ
جہاں تصویر دیکھی شاعرہ کی
وہاں بن کر گرا ''لوڈو کا دانہ''
جہاں خاتون کی تصویر نہ ہو
فقط وہ شاعری ہے احمقانہ
''اجی سنئیے'' مری بیگم یہ کہہ کر
مجھے کہتی ہے ''آیئے ! گائیں گانا''
اگر بیمار ہو جاؤں کبھی تو
میں کھاتا ہوں بنا کر'' ساگودانہ''

تنویر الدین احمد پھول

ماہیے

امی نے اُسے ڈانٹا
مانگی جو نئی امی
منے کو پڑا چانٹا

کیوں شور مچاتے ہو
کانوں کے پھٹے پردے
کیا راگ سناتے ہو

پہلے سگائی تھی
بلے کو ملا بلا
بارات بھی آئی تھی

منہ لال چقندر ہے
لاحول ولا قوۃ
انساں ہے کہ بندر ہے

زاہد بھی لگے پینے
کتنوں کو رجھایا ہے
انگور کی بیٹی نے

شوکت جمال

ہمیں کیا پتہ تھا

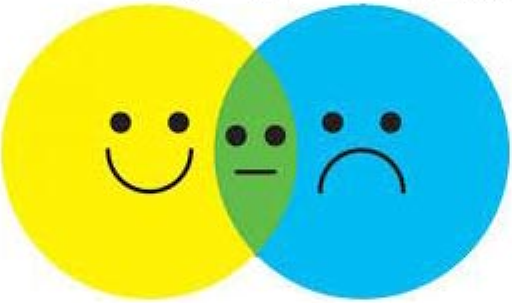

شادی کے چند روز تو چھیڑی نہ کوئی بات
حائل ہمارے بیچ رہے کچھ تکلفات

پھر ایک دن جو اُن سے مری گفتگو ہوئی
دو ٹوک بات چیت ہوئی دوبدو ہوئی

پوچھا کہ ناشتے کا کوئی انتظام ہے
بولیں مجھے پتہ ہو تو مجھ پر حرام ہے

میں نے کہا کہ چائے کی پیالی عطا کریں
کہنے لگیں کہ بات نہ ایسی کیا کریں

میں نے کہا چلیں ذرا انڈا اُبال دیں
بولیں مجھے نہ آپ یہ کارِ محال دیں

پوچھا کہ جانتی تو ہیں چاول اُبالنا؟
بولیں بلا اب اپنی مرے سر نہ ٹالنا

میں نے کہا کہ ہے کوئی روٹی کا آسرا
بولیں کھلے ہوئے تو ہیں تندور جابجا

میں نے کہا کہ گوشت پکانے کی تاب ہے؟
بولیں کہ ٹِن کے پیک میں سب دستیاب ہے

میں نے کہا کہ دال یا سبزی بنایئے
کہنے لگیں خیال یہ دل سے نکالئے

میں نے کہا ک کھانا بنانا ہے زندگی
بولیں کہ جو ملے اُسے کھانا ہے زندگی

آپس میں فیصلہ کوئی کرنا تھا ہم کو آج
پوچھا، کرے گا کون بھلا گھر کا کام کاج؟

بولیں کہ کام کرنے کی خوگر نہیں ہوں میں
بیوی ہوں آپ کی کوئی شوہر نہیں ہوں میں

شاہد عدیلی

میڈیا

خبروں میں پہلے رائی کو لاتا ہے میڈیا
پھر رائی کا پہاڑ بناتا ہے میڈیا

پہلے تو آسماں پہ بٹھاتا ہے میڈیا
اک جھٹکے میں زمیں پہ بھی لاتا ہے میڈیا

جو انگلیوں پہ اپنی نچاتے ہیں قوم کو
اُن کو بھی انگلیوں پہ نچاتا ہے میڈیا

جِسے جو جانتا نہیں دہشت کے دوستو
دہشت پسند اُس کو بناتا ہے میڈیا

گھپلوں کو کھلے بازوں کے کرتا ہے بے نقاب
نیند اور چین اُن کا اُڑاتا ہے میڈیا

بے سر کی بات اڑانا تو معمول ہے مگر
بے پر کی بات کو بھی اُڑاتا ہے میڈیا

اُلجھے گا میڈیا سے اگر بھول کر کوئی
اینٹ اُس کی اینٹ سے بھی بجاتا ہے میڈیا

مل جائے اُس کو نیوز کہیں سے کہ چیل اُڑی
اُس کو بنا کے بھینس اُڑاتا ہے میڈیا

شاہد مخالفت کھلے بندوں نہ کیجئے
ٹی وی پہ آپ کو بھی دکھاتا ہے میڈیا

سہرے کی یہ لڑیاں مبارک

شہباز چوہان

سہرے کی یہ لڑیاں تمہیں مبارک ہوں
یہ شادی کی گھڑیاں تمہیں مبارک ہوں

لو آج سے کل سردردی ختم ہوئی
راتوں کی آوارہ گردی ختم ہوئی
یہ رنگین ہتھکڑیاں تمہیں مبارک ہوں

ٹوٹ گئی مغروری، مٹا تکبر ہے
آج سے ترلے منت تیرا مقدر ہے
روسے، اڑیاں تمہیں مبارک ہوں

یار پرانے، پارٹیاں سب چھوٹ گئیں
آج سے چکن کڑاہیاں، چانپیں روٹھ گئیں
آلو بینگن ،وڑیاں تمہیں مبارک ہوں

جو چاہو گے ملے گا لیکن عرضی سے
سب کچھ گھر میں ہوگا ان کی مرضی سے
گلاں، پھجیاں ،سڑیاں تمہیں مبارک ہو

سہرے کی یہ لڑیاں تمہیں مبارک ہوں
یہ شادی کی گھڑیاں تمہیں مبارک ہوں

محمد ظہیر قندیل

شاعرہ

کاش ! کہ میں بھی شاعرہ ہوتا
میری خاطر مشاعرہ ہوتا

شہر میں ایک مرتبہ ہوتا
لازمی ہوتا شرطیہ ہوتا

شعر ہوتے مرے اچھوتے سب
بے تکی بات فلسفہ ہوتا

ہر طرف واہ واہ بس ہوتی
وزن کا بھی نہ مسئلہ ہوتا

دانت میں انگلی دابتا ہر جوشؔ
میرؔ سے بھی موازنہ ہوتا

لوگ لکھتے کہانیاں میری
میں تو بس اک مصنفہ ہوتا

لوگ کرتے سلام اوپر سے
دل ہی دل میں معانقہ ہوتا

جب مرتب کتاب ہوتی مری
نقش میرا ہی حاشیہ ہوتا

شعر ہوتے کسی بھی شاعر کے
مترنم مغنیہ ہوتا

اہلِ دل یوں خریدتے وہ کتاب
جیسے صدقۂ جاریہ ہوتا

محمد خلیل الرحمن

اشتہار

ضرورت ہے ہمیں اِک خوبرو کمسن حسینہ کی — کہ جس کی ڈیوٹی ہو گی ہمارے گھر کی رکھوالی
اِسے باورچی خانے کے بھی سارے کام کرنے ہیں — سویرے ناشتے کے سب ہی اہتمام کرنے ہیں
ہمیں پھر ناشتے کے بعد تازہ چائے مل جائے — کلی دل کی ہمارے چائے پینے سے ہی کھل جائے
ہمارے ناشتے کے سارے برتن دھو چکے جب وہ — ہمارے ناشتے سے ایسے فارغ ہو چکے جب وہ
صفائی میں ہمارے گھر کی وہ مصروف ہو جائے — بس اپنا آپ بھولے اور کچھ ایسے وہ کھو جائے
اسے بس مالکن کی تان پر لبیک کہنا ہے — بُرا ہو یا بھلا جو کچھ کہیں بس ہنس کے سہنا ہے
ہمیں دفتر کے کاموں میں ذرا سی دیر ہو جائے — تو اپنی مالکن سے کہہ کے وہ پیغام بھجوائے
کہاں پہنچے ہیں مالک مالکن بھی راہ تکتی ہے — کچھ ایسی بیکلی ہے وہ مجھے ہر دم جھڑکتی ہے
ہماری شام کو رنگیں بنانے میں وہ ماہر ہو — بنائے چائے کچھ ایسی کہ اُس کی شان ظاہر ہو
تھکن ساری ہماری چائے پینے سے اُتر جائے — ہمیں چائے پلائے اور پھر وہ اپنے گھر جائے
یہ جتنی خادمائیں مالکن نے گھر میں پالی ہیں — یہ سب بدشکل ہیں اور سب زمانے سے نرالی ہیں
کسی کی عمر پچپن سال ہے اور پانچ بچے ہیں — کوئی کالی بھجنگ اور سامنے کے دانت کچے ہیں
وہ ایسی صورتیں جانے کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں — کہاں سے اور کس مقصد سے اِن کو گھر پہ لے آئیں
ہمارے سامنے وہ کوستی ہیں ان کو تو ہر دن — مگر فارغ کریں ان کو ، نہیں ایسا نہیں ممکن

اِسی باعث تو ایسا ایڈ ہم تدوین کر بیٹھے
جسے پڑھتے ہی کوئی خوبرو آ جائے گھر بیٹھے

حمّاد حسن

ٹیڑھی کھیر

کیا بتاؤں آپ کو ہم مسئلہ گھمبیر ہے
بیوی کہتے ہیں جسے یارو وہ ٹیڑھی کھیر ہے

پہلے دن ہی اس نے قبضہ کرلیا گھر پر مرے
اس کی باتوں سے تو لگتا ہے وہ دادا گیر ہے

ہم ہوں چاہے والدہ ہوں بھائی ہو یا ہو بہن
اس کی باتوں میں سبھی کے واسطے تحقیر ہے

اونچے گھر کی لائی ہیں اماں بہو تو دیکھ لیں
زندگی بنتا جہنم ان کی اب تقدیر ہے

تھی دوکاں اونچی مگر پکوان پھیکا تھا وہاں
لے کے آئیں وہ بہو رشوت کی جو تعمیر ہے

چاند ماری کا نشاں ہیں اب میاں حمّاد حسن
بیوی کے ہاتھوں میں چپٹا بیلن اور کفگیر ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

دو مختصر نظمیں

کنجوس

اپنی دعوت میں کہا بیروں سے اِک کنجوس نے
اُس کے ہر مہمان کو وہ صرف لا کر پانی دیں
ہر دفعہ ہر شخص کو پانی پہ ٹرخاتے رہیں
چھ دفعہ کوئی اگر مانگے تو روٹی لا کے دیں
پی کے پانی بار بار اِک شخص نے اُن سے کہا
"پھنس گیا پانی گلے میں کوئی بوٹی لا کے دیں"

کورا جواب

شادی نہ کرنا مجھ سے او ڈائٹنگ کے مارے
حامل نہ ہو سکے گا تُو میری ایک کِک کا
ٹوٹی ہوئی کمر ہے مہنگائی ہی سے تیری
تو سہہ سکے گا کیسے صدمہ مری سٹِک کا
تنخواہ ہے جتنی تیری پوری مہینے بھر کی
اِس سے زیادہ خرچہ ہے میری لپ اسٹک کا

محمد عاطف مرزا

حالات کا شیونگ ریزر

اپنے کمرے میں ایک روز میں تنہا
بیٹھا سوچ رہا تھا
اپنے مستقبل کے بارے میں
ایسے ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھا
کہ ایک دم ایک بات پر چونک اُٹھا
بات کیا تھی بس ایک دھوکا تھا
کمرے میں گردش کرتی ہوئیں میری نظریں
باتھ روم کے دروازے سے اندر داخل ہوئیں
اور ایک جگہ پر جا کر رک گئیں
میں نے دیکھا
باتھ روم میں شیلف کے اوپر
شیونگ کا سامان رکھا ہوا تھا
اُس کے اوپر میری نظریں ٹھہر گئیں
غور سے دیکھا
اُس سامان سے شیونگ ریزر جھانک رہا تھا
اُس کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوندی
کہ حالات کا شیونگ ریزر
جیسے میرے ادھورے ارمانوں کو
چہرے کے بالوں کی صورت
بے دردی سے
چھیل رہا ہو، کاٹ رہا ہو

احمد علوی

سہرا

عمران خان کی دوسری شادی کے موقع پر

ضعیف دولہوں پہ لگتا ہے کیا بھلا سہرا
مرے بنے کو مبارک ہو دوسرا سہرا
عجیب لطف ہے جنت کا عقدِ ثانی میں
ٹوئسٹ آتا ہے بوڑھوں کی زندگانی میں
قدیم مقبرے بھی عالیشان لگتے ہیں
حسین سہرے میں بوڑھے جوان لگتے ہیں
اڑد ڈھلی ہوئی پیلے چنے کو راس آئے
نئی دولہنیا پرانے بنے کو راس آئے
نئی دلہن ہے نیا سال ہے نیا چولہا
مری دعا ہے کہ ہر سال تم بنو دولہا
ہر ایک سال نئی لے کے آؤ عمرانی
انگ پیار کی ہر روز کھیلو طوفانی
نئی نویلی ملے بال ہر اِک اوور پہ
رہیں چمبیلی پہ نظریں کبھی صنوبر پہ

عزیز و اقرباء دیتے ہیں دعائیں ہر دم
کہ راس آئے تمہیں یہ برانڈڈ بیگم
جنابِ اعلیٰ کی بیگم کبھی پرانی نہ ہو
بڑھاپا آئے مگر ختم یہ جوانی نہ ہو
بڑھاؤ پاک کی تم مل کے خوب آبادی
کہ راس آئے بڑھاپے میں دوسری شادی
تم اہلیاؤں میں توحید کے نہیں قائل
گئی جو زہرہ رقیہ پہ ہو گئے مائل
کہ بیویوں میں تعین نہیں کیا حد کا
کھلا ہے باب ابھی تیسری کی آمد کا
ولیمے ہم کو کھلاتے رہیں ہمیشہ آپ
لگے نہ عقدِ مسلسل میں کبھی فل اسٹاپ

ابنِ انشاء

صدارت

"جی فرمائیے"

"حضور میں ہوں گجراتی ادبی منڈل کا سیکرٹری تار محمد دکھیا۔ ہم گجراتی کے مشہور ادیب حضرت غبغب گھڑیالوی کی برسی منا رہے ہیں۔ آپ صدارت فرمائیے گا"

"دکھیا صاحب ہم انکار کر کے آپ کو مزید دکھیا نہیں بنانا چاہتے لیکن گجراتی ہم نہیں جانتے اور غبغب صاحب کا نام آج ہی سنا ہے"

"اجی یہ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کل بہترین صدارت وہی لوگ کرتے ہیں جو موضوع یا ممدوح کے متعلق کچھ نہیں جانتے"

"یہ عجیب بات ہے مثالیں دے کر واضح کیجئے تار محمد صاحب"

"آپ نے سنا ہوگا۔ پچھلے دنوں بروہی صاحب نے اقبال کی شاعری پر ایک نہایت پر مغز تقریر کی بعد ازاں فرمایا: صاحبو!" میں نہ اردو جانتا ہوں نہ فارسی"

"لیکن ہر کوئی بروہی صاحب تو نہیں ہو سکتا کہ جس چیز کے متعلق جانتا نہ ہو اس پر نہایت جامع، مانع اور بھی تقریر کرے"

"لیکن جی بیگم وقار النساء نون نے یوم اقبال اور نذر الاسلام کے مجموعی جلسے کی صدارت کر ڈالی اور بڑی دلپذیر تقریر کی"

"بھئی ہم انہیں نہیں جانتے۔ کیا پتا وہ اردو فارسی اور بنگلہ وغیرہ کی فاضل ہوں"

"نہیں جی انہوں نے وضاحت کر دی کہ مجھے یہ زبانیں نہیں آتیں اور میں نے ان شاعروں کو پڑھا بھی نہیں بس اتنا معلوم ہوا کہ عمل کی تلقین کیا کرتے تھے۔ پس اے حاضرین جلسہ تم بھی عمل کیا کرو۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے مت بیٹھے رہا کرو۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا ہے اسلام علیکم"

"بھئی ہماری مصروفیات ہیں ہمیں معاف کر دو"

"آپ ناحق گھبراتے ہیں انشاء صاحب۔ گھبرائیے نہیں۔ یوں تو آپ کو معلوم ہے، ایسے موقع پر کیا کیا جاتا ہے۔ کہیں آپ رکیں تو یہ بندہ لقمہ دینے کو تیار ہے۔ یا تو میں آپ کے کان میں بتا دیا کروں گا۔ آپ پانی پینے کے بہانے سن لیں یا پرچی لکھ کر بڑھا دیا کروں گا"

ہم نے کہا: "اچھا بھئی آپ مجبور کرتے ہیں تو منظور، ورنہ ہمارا اب بھی یہی خیال تھا کہ۔۔۔۔۔۔"

جناب تار محمد دکھیا نے ہماری گلے میں گوٹے کا چمکیلا ہار ڈالا۔ جو غالباً اس سے پہلے کئی صدروں کے گلے کا ہار ہو چکا تھا اور اس کے علاوہ مختلف منگنیوں اور شادیوں وغیرہ کے موقع پر بھی استعمال ہو چکا تھا۔ بعد ازاں ہمارا اور ہمارے علم وفضل کی بیکرانی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہر چند انشاء صاحب گجراتی زبان نہیں جانتے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ غبغب صاحب کا کسی اور زبان میں ترجمہ نہیں ہوا تاہم وہ غبغب مرحوم کے افکار اور شاعری پر بڑی گہری نظر رکھتے

آپ کو یقین آئے یا نہ آئے، مگر یہ واقعہ ہے کہ جب بھی میں نے کافی کے بارے میں استصواب رائے کیا اس کا انجام اسی قسم کا ہوا۔ شائقین میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اُلٹی جرح کرنے لگتے ہیں۔ اب میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کافی اور کلاسیکی موسیقی کے بارے میں استفسارِ رائے عامہ کرنا بڑی ناعاقبت اندیشی ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بد مذاقی ہے جیسے کسی نیک مرد کی آمدنی یا خوب صورت عورت کی عمر دریافت کرنا (اس کا مطلب یہ نہیں کہ نیک مرد کی عمر اور خوب صورت عورت کی آمدنی دریافت کرنا خطرے سے خالی ہے)۔ زندگی میں صرف ایک شخص ملا جو واقعی کافی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کی رائے اس لحاظ سے زیادہ قابلِ التفات نہیں کہ وہ ایک مشہور کافی ہاؤس کا مالک نکلا۔

مشتاق احمد یوسفی

ہیں۔ انہوں نے باوجود بے پناہ مصروفیتوں کے تشریف لا کر ہماری عزت افزائی کی ہے۔ اب میں انشاء صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ خطبہ ارشاد فرمائیں۔ ہم نے پانی مانگا، سیکریٹری صاحب نے ایک گلاس پانی آگے بڑھایا۔ ہم نے کہا کہ پورا جگ چاہیئے۔ وہ بھی آ گیا۔ ہم نے سیکریٹری صاحب کو ان کا فرض یاد دلایا اور پانی پی کر یوں رطب اللسان ہوئے:

"صاحبو! حضرت غبغب گھڑیالوی کو کون نہیں جانتا۔ پاکستان کے لیے ان کی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں (سیکریٹری نے پرچی دی۔ اُن کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہو گیا تھا) حالانکہ وہ پاکستان بننے یا پاکستان کا نظریہ پیش ہونے سے بہت پہلے ۱۹۱۴ء کی لڑائی میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے کام آ گئے تھے۔ (سرگوشی: ان کا انتقال ملیریا سے ہوا تھا، لڑائی میں نہیں) ہمارا مطلب ہے کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کے دنوں میں ایک جان لیوا بیماری سے نبرد آزما ہوتے ہوئے جان جانِ آفریں کو سپرد کی:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

ہم جب ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں (پرچی: شاعر نہیں ناول نگار تھے) جس کو غالب کی طرح وہ ذریعہ عزت نہیں سمجھتے تھے اور ان کی ناولوں کی طویل فہرست پر نظر ڈالتے ہیں (پرچی: انہوں نے صرف ایک ناول لکھا تھا "چوہے دان") جن میں سے صرف ایک چھپا باقی عدم سے ظہور میں نہ آئے یا آئے تو چوہوں نے کھا لئے، تو ان کی عظمت ہمارے دل پر نقش ہو جاتی ہے ان کے کمالِ فن کا اندازہ کرنا ہو تو ایک نظر ان کے ناول "چوہے دان" پر ڈالنی کافی ہے۔

(پرچی: چوہے دان نہیں چمنستان)

واقعی پرچی پر چمنستان ہی لکھا تھا۔ ہم جانے کیوں چوہے دان پڑھ گئے تھے۔ بہرحال اب ہم نے پانی پی کر ان کے حالات زندگی کی طرف سے گریز کیا۔

گھڑیالہ جس کی نسبت سے وہ گھڑیالوی کہلائے ایک مردم خیز قصبہ ہے (پھر پرچی آئی: گھڑیالہ کوئی قصبہ نہیں تھا، غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے) یہ بات ایک مشہور نقاد نے ایک مضمون میں لکھی ہے اسے پڑھ کر ہمیں بڑی ہنسی آئی کیونکہ گھڑیالہ نام کا کوئی قصبہ گجرات میں نہیں۔ اصل میں غبغب صاحب کے بزرگ شاہی دربار میں گھڑیال بجایا کرتے تھے۔ یہ ادبی تاریخیں لکھنے والے ذرا بھی تحقیق نہیں کرتے، جو اَنٹ سنٹ چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر حضرت شیوا چوہڑ کانوی کے بارے میں بھی ڈاکٹر غمزدہ رودولوی نے لکھا تھا کہ وہ چوہے پکڑا کرتے تھے حالانکہ چوہڑ کانہ ایک قصبہ ہے جہاں کا اچار مشہور ہے۔ شیوا صاحب بڑے شیوا بیان شاعر تھے۔ میں آپ کو چند اشعار سناتا ہوں جو صنعت مراعات انظیر میں ہیں۔ زباں پر خدایا کس کا نام آیا۔ یہ نظیر اکبر آبادی کا نہیں ورنہ ہم ان کی نظم بنجارہ نامہ کے چند بند آپ کو سناتے بلکہ بیڈھب انبالوی کا ہے (سرگوشی: صحیح نام غبغب گھڑیالوی ہے) جن کا صحیح نام غبغب گھڑیالوی تھا۔ پس ہم اس دعا کے ساتھ اپنی تقریر کو مختصر کرتے ہیں کہ خدا نئی پود کے ادیبوں کو ان کی شاعری یا ناول نگاری جو کچھ بھی وہ کرتے تھے اس کی تقلید کی توفیق دے تا کہ وہ بھی اسی طرح آنکھیں کھول کر مظاہرۂ قدرت کا مشاہدہ کریں جس طرح

ہسٹری اور ہسٹریا

مارچ 1942 کا ذکر ہے۔ بی۔ اے کے امتحان میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ میں روہیلوں کی لڑائیوں سے فارغ ہو کر مرزا عبدالودود بیگ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ جھوم جھوم کر کچھ رٹ رہے ہیں۔ پوچھا ''خیام پڑھ رہے ہو؟''

کہنے لگے ''نہیں تو! ہسٹری ہے۔''

''مگر آثار تو ہسٹیریا کے ہیں!''

مشتاق احمد یوسفی

غبغب صاحب کرتے تھے اقبال بھی کہہ گئے:

کھول آنکھ فلک دیکھ زمیں دیکھ فضا دیکھ

سیکریٹری صاحب نے پرچی دی "غبغب صاحب تو نابینا تھے" لیکن یہ بعد از وقت آئی تھی اس لیے ہم نے ایک طرف ڈال دیا اور پانی کا ایک گلاس پی کر تالیوں کی گونج میں بیٹھ گئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل اقبال کا صحیح مقام بھی انگریزی زبان ہی میں متعین کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کسی نہ کسی غیر ملکی کو بلایا جاتا ہے۔ اب کے ایک یوم اقبال تو ایرانی کلچرل سینٹر میں منایا گیا۔ ایک ہم نے اپنا علم دوست احباب کے ساتھ مل کر اپنے کلب میں منایا۔ ہمیں صدارت کے لیے کسی غیر ملکی کی تلاش تھی۔ خوش قسمتی سے کسی نے ہمیں ہالینڈ کے ایک نکتہ داں مسٹر ہیگ روٹرڈم سے ملا دیا اور وہ صدارت پر بھی راضی ہوگئے ہم نے کہا: آپ کو کچھ اقبال کے متعلق بتادیں۔ بولے: واہ! اس مایہ ناز ہستی کو کون نہیں جانتا، اس نے فلسفہ خودی ایجاد کیا تھا نا۔ بس یہ بتادیں کہ رہنے والے کہاں کے تھے۔ ہم نے کہا: سیالکوٹ جہاں کھیلوں کا سامان بنتا ہے۔ فرمایا: مرگئے یا ابھی مرنا ہے۔ ہم نے کہا: آپ کی اور ہماری خوش قسمتی سے مرگئے ہیں۔ بولے: کیوں مرگئے؟ ہم نے کہا: ہم خود بھی حیران ہیں کہ ملت کو ابتلاء میں چھوڑ کر کیوں مرے"

فرمایا: ''میرا مطلب ہے کیسے مرگئے بس حکیموں ڈاکٹروں کی دوائیں کھا کر مرے لیکن آپ کو اس سے مطلب؟ آپ ان کی شاعری اور شخصیت پر بولیے"

"اچھا۔ نام ذرا پھر سے بتا دیجئے۔ ایکو بلال تھا شاید"

ہم نے کہا: "ایکو بلال نہیں بابا۔ اقبال۔ ٹھیک سے یاد کرلو"

مسٹر ہیگ روٹرڈم نے اپنی پر مغز تقریر کا آغاز ہی سیالکوٹ سے کیا۔ اس کی وجہ شہرت بیان کی اور فرمایا: اقبال بھی کھیل ہی کھیل ہم بہت سی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ آج کل تو فلسفہ خودی کی بہتات ہے۔ بلکہ اسے وساور بھیج کر زر مبادلہ بھی کمایا جاسکتا ہے لیکن یہ ایجاد اس شاعر نامی گرامی کی تھی۔ یہ فارسی اور اردو میں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ اے کاش ڈچ زبان کی شیرینی پر ان کی نظر گئے ہوتی۔ وہ اس میں لکھتے اور ہم ان کا مطالعہ کر سکتے۔ اب ہم سب کو چاہئے کہ ان کے نقش قدم پر چلیں اور ان کا اجالا زمانے میں پھیلائیں، جس طرح فلپس کمپنی کے بلب پھیلاتے ہیں جس کی پاکستان میں نمائندگی کا شرف اس ناچیز کو حاصل ہے۔ یہ کمپنی صرف بلب ہی نہیں ریڈیو، ٹرانزسٹر، ٹیلی ویژن، ٹیوب لائٹ ہر طرح کا مال عمدہ بناتی ہے اور بکفایت فراہم کرتی ہے (ہم نے انہیں ٹھوکا دیا کہ موضوع پر آئیں) اور ہاں ایکو بلال (ہم نے ایک اور ٹھوکا دیا) یعنی اقبال صاحب بہت بڑے اور مایہ ناز شاعر تھے۔ سمجھ نہیں آتی کہ کیوں مرگئے اور قوم کی نیا بھنور میں چھوڑ گئے (تالیاں) سنا ہے کہ ڈاکٹروں اور حکیموں کی دوائیں کھا کھا کر مر گئے۔ ابھی طبی سائنس کو اور ترقی کرنی ہے۔ فلپس کمپنی نے اس پر بھی ریسرچ کا شعبہ کھولا ہے۔ ہماری تحقیقات کامیاب ہوگئیں تو آئندہ اچھے اچھے شاعر مرا نہیں کریں گے بلکہ صدیوں ایڑیاں رگڑا کریں گے۔ ان کی جان نہیں نکلا کرے گی (تالیاں) میں شکریہ ادا کرتا ہوں (ہمارا نام بھول گئے) اپنے محترم دوست کا جنہوں نے مجھ ہیچمدان کو عزت سے نوازا اور کرسی صدارت پر بٹھایا۔ بے شک اقبال سے مجھے بے حد دلچسپی ہے اور میں اور بھی تقریر کرتا لیکن افسوس ہال میں روشنی بہت ہی کم ہے۔ اگر آپ لوگ فلپس کی ٹیوب لائٹیں استعمال کرتے ---------

ان کی تقریر کا آخری حصہ تالیوں کے شور میں ڈوب گیا۔ ٹھیک سے سنا نہ جاسکا۔

شرارتی لکیریں

مصرع نہیں اُٹھتا تو کیا کروں؟ کیا اب اِسے
اُٹھانے کے لئے کوئی مزدور ڈھونڈوں؟؟

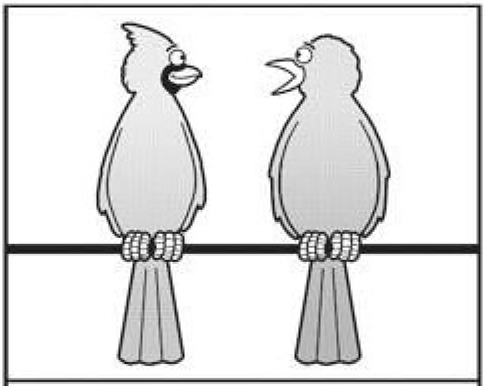

بے فکر رہو۔۔۔ اُس کے پاس صرف ایک
پتھر ہے، وہ ہم دونوں کو نہیں مار سکتا۔۔۔

یہ تمہارا انکشاف ہونا کب شروع ہوگا؟

نشانے بازیاں کیا کیا ...

سکرپٹ رائٹر

یہ میرے سلیپر کہاں گئے؟
ٹھہرو! میں گوگل میں ڈھونڈتا ہوں
Google
2004
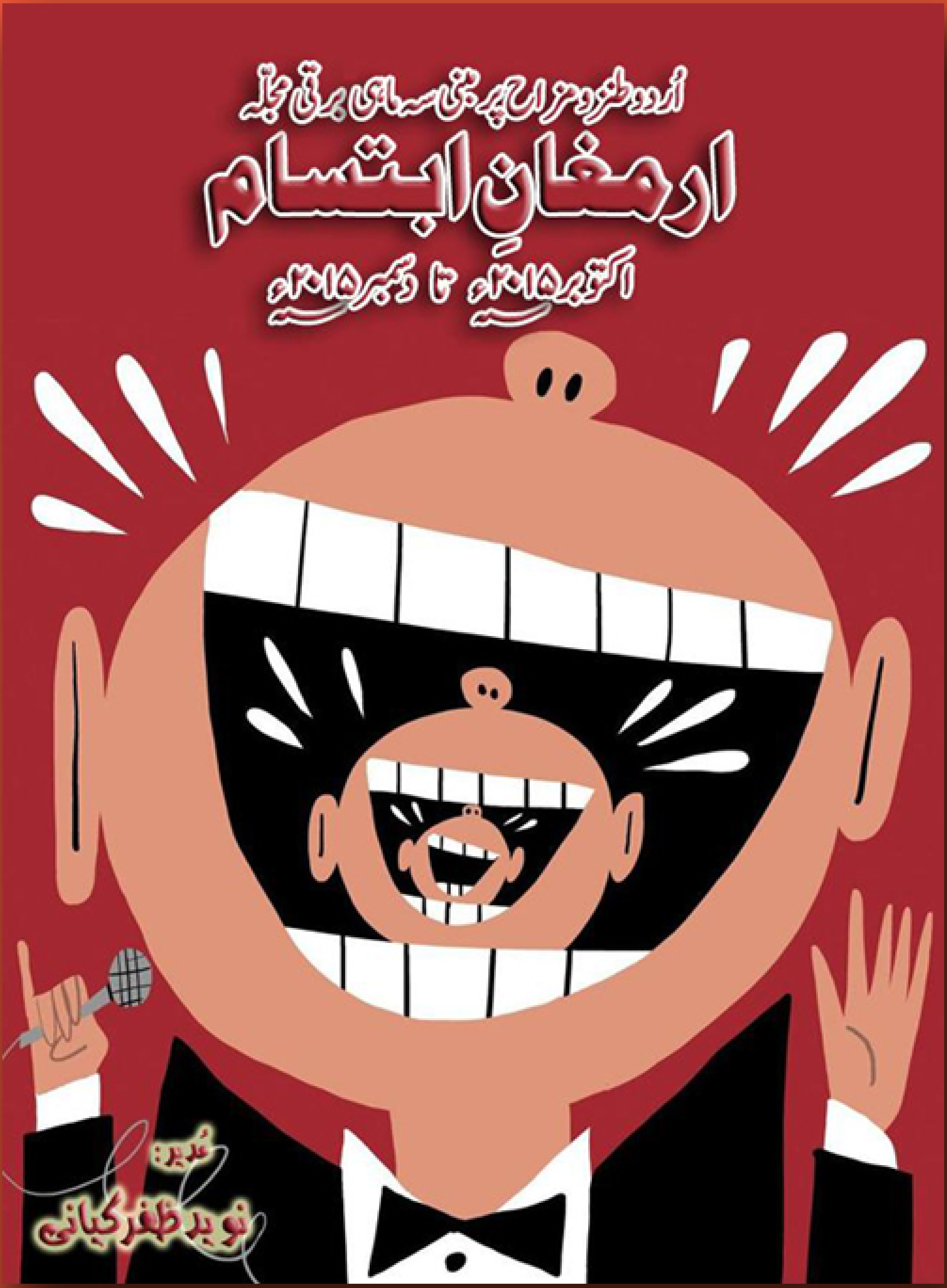
ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ